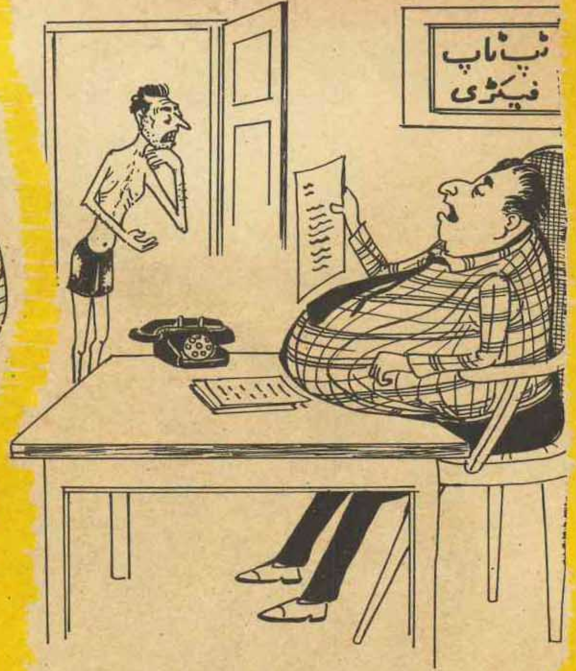
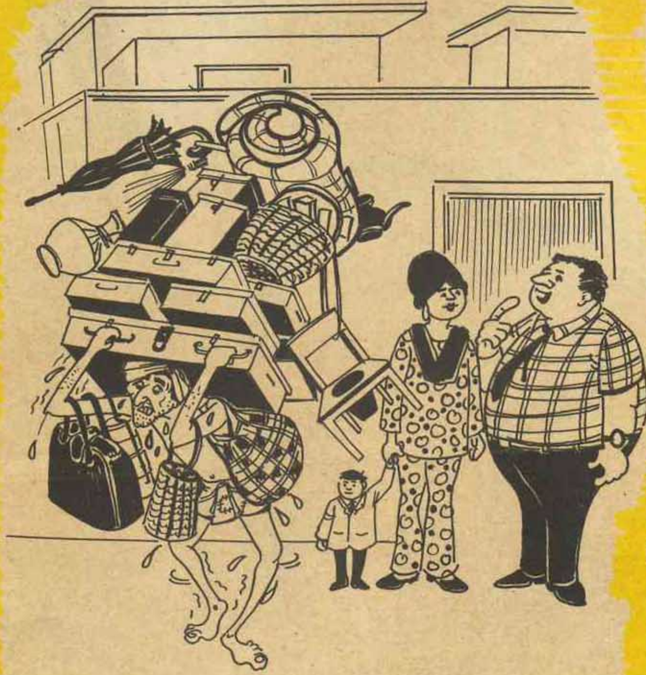


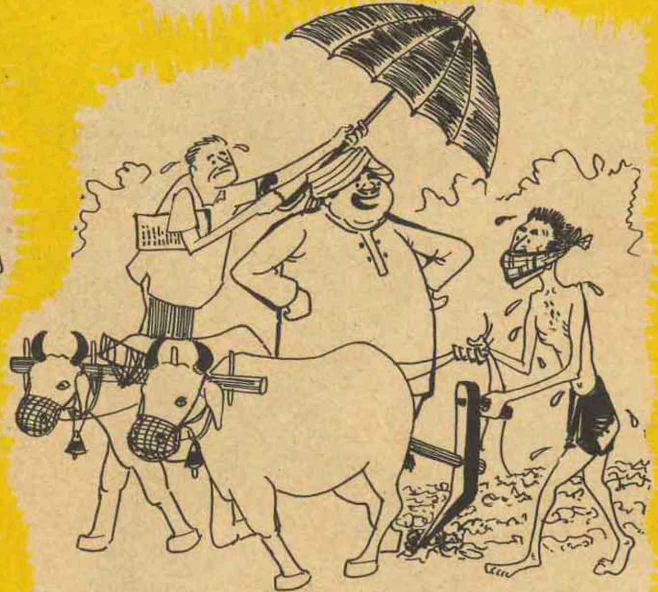
ہفت روزہ
الفتح
کراچی
پاکستان میں کیا ہونے والا ہے؟
۱۶-۲۳ ستمبر ۱۹۷۱ء
قیمت :- ۵۰ پیسے
ہوائی ڈاک سے :- ۷۵ پیسے
پاکستان
آرٹس کونسل
پردہ چاک
ANWAR

تمہاری ہمیشہ کی چھٹی ۔ تم تو اس جان سے بھی سال بھر نکال لو گے مگر میں
تمہیں سال بھر کا بونس کس جی سے دوں گا ۔





گدھا گاڑی کی کیا ضرورت ، یہ جانور کم خرچ ہے ۔ بوجھ لادنے
کی کوئی قانونی حد نہیں ہے ۔



تینوں جانوروں کا منہ بند کر دیا ۔ کھا بھی نہیں سکتے
کھانے کے لئے چلّا بھی نہیں سکتے ۔



قانون جیب میں ،
تالا چابی ہاتھ میں ،
تنخواہ مانگنے کی جرأت نہ کرنا

خدا کی بستی کے مظلوم عوام کا ترجمان

ہفت روزہ
الفتح
کراچی

جلد:- ۲ شمارہ:- ۱۸

۱۶-۲۳ ستمبر ۱۹۷۱ء

نگران
شوکت صدیقی
محمود شام

مدیر
ارشاد راؤ

معاونین خصوصی
ابراہیم جلیس، افضل صدیقی، عبدالحمید چھاپرا

مجلسِ ادارت
وہاب صدیقی - نعیم آروی

آرٹ ایڈیٹر
غلام نبی بزمی

سرورق:- انور سمیع

بدلِ اشتراک

	فی پرچہ	سالانہ	ششماہی
	۵۰ پیسے	۲۵ روپے	۱۳ روپے
ہوائی ڈاک سے،	۷۵ پیسے	۴۰ روپے	۱۶ روپے

بحرین، کویت:- ۶۰ فلس دوبئی، قطر: ۷۵ درہم
سعودی عرب:- ۱۵ قرش- انگلستان ۲ شلنگ ۶ پنس

مقام اشاعت
ہفت روزہ الفتح ۸۷ ڈی، تیسری کمرشل ایریا
پی، ای - سی - ایچ - ایس کراچی-۲۹

ایڈیٹر پبلشر، ارشاد راؤ
مطبع حقی آفسٹ پریس، لیاقت آباد-کراچی

اداریہ

پاکستان میں کیا ہونے والا ہے؟

وقت تیزی سے گزر رہا ہے

مزدور، کارخانوں سے نکالے جا رہے ہیں۔ کسانوں کی بے دخلیاں ہو رہی ہیں، روزانہ ضرورت کی چیزیں مہنگی ہوتی جا رہی ہیں۔ لوگ سوچنے لگے ہیں کہ اُنھیں ایک وقت کا کھانا مل جائے تو بڑی بات ہے۔ کسی قوم میں ۲۳ برس بعد یہ بے یقینی کی کیفیت پیدا ہو جانا کتنا افسوسناک ہے۔ دل خون کے آنسو روتا ہے۔ ایک عام آدمی کی حالت روز بروز خراب ہوتی جا رہی ہے۔ انسان کی کوئی وقعت نہیں رہی ہے۔ لاکھوں کروڑوں محنت کش، غریب مزدور، کسان جو اس ملک کی اکثریت ہیں، ملک کے دست و بازو ہیں۔ وہ ایک طرف تو ایک وقت کی روٹی حاصل کرنے کے لئے اپنا خون پسینہ ایک کرتے ہیں، دوسری طرف معمولی معمولی مسائل حل کروانے کے لئے سرکاری دفتروں کے عمر بھر طواف کرتے رہتے ہیں، ان دفتروں میں اِن ہم وطنوں کے ساتھ جو سلوک کیا جاتا ہے اسے دیکھ کر انسان کے اشرف المخلوقات ہونے پر شک ہونے لگتا ہے۔ نوکر شاہی اپنے جوہر دکھا رہی ہے۔ پولیس نے ظلم و تشدد کی انتہا کر دی ہے۔ کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔ کوئی ٹوکنے والا نہیں ہے۔ جن افراد کو عوام نے نمائندگی کی سب سے بڑی امانت دی تھی، وہ بے بس ہیں۔ ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ عوام نے اُنھیں جو عزت دی ہے اُسے بیوروکریسی تسلیم نہیں کرتی۔ اس ساری صورتِ حال کی وجہ ہے کہ موجودہ حکومت اپنی پالیسی کا واضح طور پر اعلان نہیں کر رہی ہے۔ اور عوام کو اعتماد میں نہیں لے رہی ہے۔ اس وقت طرح طرح کی افواہیں گشت کر رہی ہیں۔ ان افواہوں کو تقویت اسی لئے ملتی ہے کہ حکومت عوام سے رابطہ قائم نہیں کرتی۔ اس وقت وہ غیر ملکی طاقتیں، جنھوں نے مشرقی پاکستان میں علیحدگی کی تحریک کی سرپرستی کی تھی۔ اب اس تحریک کے ناکام ہو جانے کے بعد وہ پھر پاکستان کی حمایت کا دم بھرنے لگی ہیں۔ امداد کا یقین دلایا جا رہا ہے۔ ان میں امریکہ سب سے آگے ہے ہم کبھی تسلیم نہیں کرتے۔ امریکی سامراج پاکستان کا خیر خواہ ہو سکتا ہے۔ وہ اب اسلام آباد سے سائیگان تک ایک ہی پالیسی اختیار کرنا چاہتا ہے۔ لیکن پاکستان کے مزدور، کسان، طالب علم اور دانشور پوری طرح خبردار ہیں، وہ کسی صورت امریکی سامراج کی سازشوں کو کامیاب نہ ہونے دیں گے۔ خواہ وہ کسی ذریعے سے ہوں، کسی سیاسی جماعت کے یا کسی غیر ملک کے ذریعے۔

پاکستان کے عوام محبِ وطن سیاسی جماعتوں، مزدوروں اور کسانوں کا پرچم بلند کرنے والی جماعتوں پر زور دیتے ہیں کہ وہ اُن کے ساتھ ہیں اور وہ دیکھیں، کہ پاکستان میں کیا ہونے والا ہے۔ دوستوں اور دُشمنوں کے چہرے پہچانیں۔ سامراج کی سازشوں پر غور کریں، سامراجی ایجنٹوں کے نقاب اُلٹیں۔ وطن دُشمن طاقتیں اپنا بھیانک کردار ادا کر رہی ہیں۔ عوام نے انتخابات میں اپنا فیصلہ دیا تھا۔ پُرامن ذریعے سے اقتدار کی منتقلی چاہی تھی، لیکن حالات خراب ہو گئے ہیں۔ کیسے ہُوئے؟ کس نے کیے؟ یہ بات اس وقت سوچنے کی نہیں۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ حالات مزید خراب نہ ہونے دیئے جائیں۔ عوام کو، عوام دوست افراد کو،

باقی صفحہ ۴۳ پر ملاحظہ فرمائیں

یہ وقتِ عمل ہے، فیصلے کی گھڑی ہے

ساحر

سنو آواز آرہی ہے۔

"پاکستان جن حالات سے آج دوچار ہے ان سے متاثر ہونا اور دل و دماغ میں تحریک فکر ہونا ایک محبِ وطن کے لئے لازمی ہے"

"اے اہلِ قلم اے صاحب نظر و فکر، یہ وقت فقط تعمیر کا ہے اور قوم کو زوال سے بچانے کا ہے، فکر و قلم کی لغزشوں کا نہیں، دیانت و امانت کے ساتھ اصلاحِ حال کا ہے۔ یہ وقت حقِ قلم ادا کرنے کا ہے"

"اے علمائے کرام، یہ وقت یک جہتی کا ہے، کئی زبانیں بولنے کا نہیں، یک زبانی اور اشتراکِ فکر لازمی ہے خیر البشرؐ کے پیغام کو مختلف زبانوں میں بانٹنے کا نہیں!"

"اے اساتذہ عظام، یہ وقت طلبا میں قومی رُوح پھونکنے کا ہے۔ تعمیری قوتوں کو بروئے کار لانے کا ہے، یہ وقت تعمیرِ کردار کا ہے، دائرہ عمل بڑھانے کا ہے، یہ وقت خود احتسابی کا وقت ہے، یہ وقت جہدِ انقلاب کا ہے"

سنو آواز آرہی ہے، قوم اس وقت ذہنی کشمکش رُوحانی اضطراب اور فیصلہ کرنے نہ کرنے کے تذبذب میں مبتلا ہے قوم اس وقت دوراہے پر کھڑی ہے، یہ وقتِ عمل ہے۔ یہ فیصلہ کی گھڑی ہے،

"سنو، یہ وقت خود کفالتی کے کٹھن سفر کے آغاز کا ہے یہ وقت کاسۂ گدائی کو توڑنے کا ہے، یہ خود آگہی کا وقت ہے، یہ ہوشمندی کا تقاضا ہے، یہ قومی غیرتِ نفس کا سوال ہے، یہ وقت ایثار و قربانی خلوص و محبت، شرافت و انسانیت کا ہے"

یہ بحرانی دور ہے، سخت وقت آن پڑا ہے، یہ اتفاقی حادثہ نہیں، اس بحران کے پس پشت ایک طویل داستان ہے'

"سنو، فکر و عمل کی قوتوں کو بروئے کار لاؤ، ایک منزل تجویز کرو، اپنے آپ کو حالات کے رحم و کرم پر نہ چھوڑو،"

"اپنا فرض ادا کرو، اپنے حقوق کے لئے جدوجہد کا بھرپور آغاز کرو، اپنے حقوق کو پامال نہ ہونے دو،"

"صالح نظام کے قیام میں سب لوگوں کی شرکت ضروری ہے، یہ شرکت صرف ایک حق ہی نہیں بلکہ فرض بھی ہے، ملک کے مسائل حل کرنا، ایک فرد، کسی ایک جماعت یا صرف حکومت کا فرض نہیں تم سب کا ہے،"

یہ نادان، یہ خود غرض، یہ غافل مسائل کو حل نہیں کرتے! ٹالتے ہیں، انہیں اُلجھاتے ہیں، تاکہ یہ چند لوگ فائدے ہی فائدے حاصل کریں اور باقی سب لوگ مشکلات جھیلتے رہیں، یہ طبقاتی نظام کے علمبردار خود غرضانہ افعال کے مرتکب ہیں، یہ ذاتی فائدے کو اجتماعی فائدے پر مقدم گردانتے ہیں، انفرادی مفاد پر قومی مفاد کو تج دیتے ہیں، یہ متعدی مرض ہے، یہ وبا ہے۔ اور یہ اپنی کوتاہ نظری سے قوم کو افراتفری، نفسانفسی لوٹ کھسوٹ استحصال میں مبتلا کر دیتے ہیں۔

سنو، جاگو، اصلاحِ حالات کی طرف قدم بڑھاؤ۔ کہ متاعِ کارواں چلا گیا، خود آگہی، خود اعتمادی کو کام میں لاؤ،

بیرونی امداد نے اس ملک میں کیا گل کھلاتے ہیں، وہ دودھ اور شہد کی نہریں بہا دینے والے کہاں چلے گئے، یہ نہریں چند گھرانوں میں بہتی ہیں، یہ کروڑوں گھرانوں کا ملک ہے

سنو، غور سے سنو، بیرونی امداد کا چھلاوا دکھانے والو، تم نے شرفِ انسانیت کی توہین کی ہے، تم نے درسِ خیر البشرؐ کو فراموش کر دیا، تم نے اپنے قومی وقار کو خود غرضیوں کی بھینٹ چڑھا دیا، تمہاری ذاتی خوشحالی تمہارے گریبان تار تار کرنے کا چارہ بنے گی، تم نے ملکی نظام کو آزاد اور خود مختار بنانے کی بجائے پابندِ سلاسل کر دیا۔ اب تمہارے لئے ایک اور پاکستان نہیں بنے گا، پاکستان بن چکا ہے۔ پاکستان زندہ رہے گا۔ سب سے پہلے پاکستان، پاکستان، پاکستان،

سنو، علمائے کرام

سنو، صحافیو!

سنو، اساتذہ کرام سنو! سیاسی قائدین۔

"سنو، امراء یہ وقت اختلافات کو ہوا دینے کا نہیں، یہ وقت ضروری اختلافات کی حدود میں رہتے ہوئے بھی، جذبہ حب الوطنی کے ابھارنے کا ہے، یہ وقت سعی ہے۔ یہ وقت عمل ہے، یہ ایثار کا وقت ہے، یہ قربانی کا وقت ہے عوام کو قربانی کا بکرا بنانے کا نہیں، اقلیتی دنبو! تمہارے اور موٹے ہونے کا وقت گذر چکا ہے، اب قربانی کا فائدہ سب کو ملے گا، قربانی دینے والوں کو سب سے پہلے،"

"یہ دیانت، انصاف کی پکار ہے، یہ ایک منصفانہ معاشرے کے قیام کا تقاضا ہے"

سنو، سیاسی شعبدہ بازو، بازی گری ختم ہو چکی ہے، پینترا بدلنے کا موقع نکل چکا ہے، تمہارے چہرے جانے پہچانے ہیں، تمہارا ادغام جاہ پسندی کا مظہر ہے، قابلِ نفرین ہے! تمہاری گروہ بندی تمہیں لے ڈوبے گی، کیونکہ یہ تمہارا آخری حربہ ہے"

علمائے کرام، پیغامِ حق کو پہچانو، تم سے سوال ہوگا۔ تم جو کہتے تھے وہ کرتے کیوں نہیں تھے، خود بدلو، قرآن کو نہ بدلو' اللہ کے پیغام کو نہ بدلو، تمہارے فربہی جسم مخلوقِ خدا کو بھوک سے مرتے ہوئے دیکھ کر لرزتے کیوں نہیں، تم پر رعشہ کیوں نہیں طاری ہوتا۔ لیکن تاویلات کے پھیلاؤ میں تو تمہاری روٹی ہے تمہیں پیغامِ حق کی پہچان سے مطلب !

اے صاحبِ ثروت، پیسے کی محبت تمہیں جہنم کی آگ کی خوشخبری دے رہی ہے، یہ قرآن کہہ رہا ہے۔ قرآن جو پہاڑوں پر اترتا تو وہ ریزہ ریزہ ہو جاتے، یہ تم کیوں بھول گئے ہو کہ سیدنا ابوبکرؓ نے کہا تھا، میں تو اپنے گھر میں اللہ اور آپ کا نام چھوڑ آیا ہوں، سوچو ذرا غور سے سوچو، ہمسائے کے بھوکے سونے پر سوال ہوگا، تمہارے اردگرد تو لاکھوں بندگانِ خدا بھوکے سوتے ہیں، تمہیں دولت کما کر دینے والے بھی بھوک و افلاس سے دوچار ہیں، ان کے ہاں تو مٹی کا ایک دیا بھی نہیں جلتا

قوم سے کمائی ہوئی دولت قوم کی بھلائی کے کام ہی آنی چاہیئے، تمہاری سیاہ دولت تمہاری سیاہ بختی کی نشانی ہے مفلس قوم میں چند دولت مند کبھی خوش نہیں رہ سکتے، اپنی دولت کو پھیلاؤ، معاشرے میں احتیاج کو ختم کرو، پیشتر اس کے کہ تمہارا احساب یہیں پر شروع ہو جائے۔

"اے قلم کے امانت دارو، تمہارا قلم ایک مقدس امانت ہے، ایک روشنی ہے۔ وقتی مصالح سے اسے آزاد کرو، سیاہ، سیاہ ہے اور سپید سپید،"

اساتذہ کرام، معمارانِ قوم، ان بچوں میں جنہیں تعلیم میسر ہے، روحِ آزادی پھونکو، علم کی افادیت بتاؤ، علم دیانت، محنت کا انہیں سبق دو، بارِ امانت کا حق ادا کرو،

اے اہلِ ہوس! تم نے معاشرے کو گھن لگا دی۔ تم نے رشوت کے ناسور کی پرورش کی ہے۔ تم نے رشوت کے ذریعے عیش و عشرت کی وبا پھیلائی ہے۔ تم شریف نہیں ہو

باقی صفحہ ۳۳ پر ملاحظہ فرمائیں

الفتح کراچی

جامعہ کراچی میں سی آئی اے کے ایجنٹ کیا کر رہے ہیں

جامعہ کراچی کے اسلام پسند استاد

ڈاکٹر علی اشرف نے لندن میں سیاسی پناہ حاصل کرلی

جامعہ کراچی کے شعبۂ انگریزی کے سربراہ ڈاکٹر علی اشرف نے پاکستان سے فرار ہو کر لندن میں سیاسی پناہ حاصل کرلی ہے اور آج کل نام نہاد "بنگلہ دیش" کی خدمت انجام دے رہے ہیں، یہ انکشاف جامعہ کراچی سے تعلق رکھنے والے باخبر حلقوں نے کیا ہے، ان حلقوں کے مطابق جامعہ کے سابق وائس چانسلر ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کے علاوہ چند دوسرے ممتاز اساتذہ کا بھی نام لیا جا رہا ہے، جنہوں نے ڈاکٹر علی اشرف کے ملک سے فرار ہونے میں اعانت کی یا کسی نہ کسی طور پر اس سازش میں ملوث ہیں۔

ڈاکٹر علی اشرف تعلیمی اور علمی حلقوں میں "اسلام پسند" کی حیثیت سے پہچانے جاتے تھے۔ وہ جامعہ کراچی کے اس گروہ کے ایک اہم رکن تھے، جو جامعہ میں جماعت اسلامی کی سرپرستی کرتا ہے۔ یہ وہی ٹولہ ہے جس نے جامعہ کراچی کو مودودیت کا قلعہ بنا دیا ہے، ڈاکٹر قریشی اس ٹولہ کے سرغنہ تھے اور علی اشرف ان کے دست راست تھے، علی اشرف جماعت اسلامی مشرقی پاکستان کے امیر جماعت پروفیسر غلام اعظم کے دیرینہ دوست اور نظریاتی طور پر ہم خیال تھے۔ ان کے بارے میں یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ وہ جماعت اسلامی کے رکن ہونے کی حد تک متفق تھے۔ لیکن اپنی سرکاری ملازمت کے پیش نظر وہ اس کا برملا اظہار نہیں کرتے تھے۔

ڈاکٹر علی اشرف لندن کس طرح پہنچے اور وہاں جانے کی انہیں اجازت کس طرح حاصل ہوئی اس سلسلے میں جامعہ کراچی سے قریبی تعلق رکھنے والوں سے معلوم ہوا ہے کہ جولائی ۱۹۷۱ء میں نیویارک میں انگریزی ادبیات کی تدریس کے موضوع پر ایک سیمینار منعقد ہوا جس میں دوسرے ممالک کے علاوہ پاکستان سے بھی ایک ماہر تعلیم کو شرکت کی دعوت دی گئی۔ بتایا جاتا ہے کہ اس سیمینار یعنی مجلس مذاکرہ کا اہتمام ورلڈ یونیورسٹی سروس نے کیا تھا۔ یہاں یہ بات خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے کہ ورلڈ یونیورسٹی سروس امریکہ کا وہ ادارہ ہے جس کے بارے میں امریکہ کے ایک اخبار نے یہ سنسنی خیز انکشاف کیا تھا کہ یہ ادارہ امریکہ کے رسوائے زمانہ ادارۂ جاسوسی سی۔ آئی۔ اے کی زیر نگرانی قائم ہوا تھا۔ اور اسی کی سرپرستی میں آج بھی کام کرتا ہے۔

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، ورلڈ یونیورسٹی سروس کے صدر ہیں اور پاکستان میں اس کی تمام سرگرمیاں ان کی نگرانی میں ہوتی ہیں، چنانچہ مجلسِ مذاکرہ کا دعوت نامہ بھی ان ہی کے توسط سے پاکستان کو ملا۔ ڈاکٹر قریشی اس وقت جامعہ کراچی کے وائس چانسلر تھے معلوم ہوا ہے کہ مرکزی وزارت تعلیم نے اس سلسلے میں ان سے رجوع کیا۔ ڈاکٹر قریشی نے پروفیسر علی اشرف کا نام تجویز کیا اور یہ سفارش کی اس بین الاقوامی مذاکرہ کے لئے علی اشرف نہایت موزوں اور مناسب ہیں بتایا جاتا ہے کہ ڈاکٹر قریشی کی پر زور سفارش پر وزارتِ تعلیم نے ڈاکٹر علی اشرف کا انتخاب تو کر لیا مگر وزارت داخلہ نے ان کو ملک سے باہر جانے کی اجازت نہ دی۔ اس سلسلے میں جو وجوہ بتائی جاتی ہیں ان میں بنیادی اور بہت اہم سبب یہ بھی تھا کہ علی اشرف کے حقیقی بڑے بھائی ڈاکٹر علی احسن کئی ماہ سے کلکتہ میں موجود ہیں اور "بنگلہ دیش" کے پروپیگنڈے میں پیش پیش ہیں، وہ چٹاگام یونیورسٹی میں شعبۂ بنگلہ کے سربراہ تھے۔ گذشتہ مارچ کے آخری ہفتے میں جب افواج پاکستان نے علیحدگی پسندوں کے خلاف اپنی کارروائی کا آغاز کیا تو دوسرے بھگوڑوں کے ساتھ ڈاکٹر علی احسن بھی چٹاگام سے فرار ہو کر کلکتہ پہنچ گئے۔

ڈاکٹر علی اشرف کو ملک سے باہر جانے کی اجازت نہ ملنے کی وجہ ان کی بعض پراسرار سرگرمیاں بھی تھیں۔ جنہوں نے ان کے کردار کو مشکوک بنا دیا تھا۔ ڈاکٹر علی اشرف پی۔ ای۔ این کی پاکستان شاخ کے سربراہ تھے، اس کا دفتر کہاں قائم تھا۔ اس کی سرگرمیاں کیا تھیں۔ اس پر ہمیشہ پردہ پڑا رہا، البتہ سال دو سال میں جب کسی بیرونی ملک میں اس ادارے کے تحت کوئی بین الاقوامی قسم کا اجتماع ہوتا تو ان میں پاکستانی نمائندے کی شرکت کی بھی اطلاع ملتی، عام طور پر ایسے اجتماعات میں نمائندگی کے فرائض ڈاکٹر علی احسن یا ڈاکٹر علی اشرف انجام دیتے یا ان کا کوئی قابل اعتماد نمائندہ شرکت کرتا۔ پی۔ ای۔ این کہنے کو تو اہل قلم کا ادارہ ہے مگر پاکستان کا کوئی قابل ذکر ادیب یا شاعر اس سے کبھی وابستہ نہیں رہا، دوسرے ممالک سے اس کے اجتماعات میں شرکت کے لئے جو نمائندے آتے ہیں۔ ان کا بھی یہی حال ہے۔

پی۔ ای۔ این کے اجتماعات میں کھل کر امریکی پالیسیوں کی حمایت کی جاتی ہے اور سوشلزم کے خلاف دشنام طرازی اور ہر طرح کی مذمت ہوتی ہے۔ پھر یہ راز بھی افشا ہو گیا کہ پی۔ ای۔ این دراصل سی آئی اے کا ذیلی ادارہ ہے اور اس کا تعلق سی آئی اے کے شعبۂ ثقافت سے ہے۔ اس کی سرگرمیوں کے لئے کروڑوں ڈالر کی مالی امداد ہر سال مہیا کی جاتی ہے۔ یہ ڈالر پاکستانی پی۔ ای۔ این کو بھی ملتے۔ یہ رقم کس طرح خرچ ہوتی تھی۔ اور کہاں خرچ ہوتی تھی۔ اس کا کبھی سراغ نہ ملا۔ کئی سال قبل اخبارات میں اس پر لے دے بھی ہوئی۔ لوگوں نے الزام لگایا کہ یہ تمام رقم دونوں بھائی اپنے چند رازداروں کے اشتراک سے ہڑپ کر جاتے ہیں۔ اور کوئی نہ کوئی بہانہ نکال کر غیر ممالک کی سیر کرتے ہیں۔

سی آئی اے کا ایک اور ذیلی ادارہ ہے۔ کانگریس فار کلچرل فریڈم یہ اس وقت قائم ہوا تھا۔ جب ہنگری میں شورش برپا ہوئی اور سوویت یونین نے اسے کچلنے کے لئے اپنی فوجیں ہنگری میں اتار دیں اس کانگریس کا تعلق بھی سی آئی اے کے شعبۂ ثقافت سے ہے۔ نیویارک، لندن اور پیرس میں اکثر اس کے

پاکستان سے فرار ہونے میں ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے تحریری مدد کی

بین الاقوامی اجتماعات ہوتے ہیں۔ اس میں جو پاکستانی مندوب شرکت کرتے اس کی اطلاع ہمیشہ بیرونی اخبارات سے ملتی۔ جو ادیب قسم کے لوگ پاکستان سے اس میں شرکت کے لئے جاتے، نہ ان کے جانے کی اور نہ واپسی کی اطلاع کبھی ملتی۔ نہ انہوں نے کبھی کچھ یہ بتایا کہ اس اجتماع میں کیا ہوا۔ پاکستانی نمائندے نے اس میں شرکت کی تو کیوں کی اور ملک کی کیا نمائندگی کی۔ ان اجتماعات میں امریکہ کی ویت نام پالیسی، اس کی جارحیت اور ظلم و ستم کی بے شرمی کے ساتھ حمایت کی جاتی۔ چین اور روس کے خلاف قراردادیں منظور ہوتیں۔ مگر کشمیر کا ذکر کبھی نہ آیا۔ کبھی کشمیریوں پر بھارتی ظلم و تشدد کے خلاف آواز نہ اٹھائی گئی۔

ڈاکٹر علی اشرف پاکستان میں کانگریس فار کلچرل فریڈم کے بھی کرتا دھرتا تھے۔ ویسے جب سی آئی اے کے اس ذیلی ادارے کا قیام عمل میں آیا۔ تو اے کے بروہی اس کے کنوینر مقرر ہوئے اور گمان غالب ہے کہ آج بھی بروہی اس کے کنوینر ہیں اس ادارے کے کسی اجتماع میں پاکستان کے کسی جانے پہچانے اہل قلم نے کبھی شرکت نہیں کی اور نہ کبھی اس سے وابستہ رہا۔ اس ادارے کی پاکستان شاخ کا صرف یہ کام رہا ہے کہ عوامی جمہوریہ چین، سوویت یونین اور دوسرے سوشلسٹ ممالک کے خلاف تقریریں کی جائیں، کتابچے اور پمفلٹ شائع کئے جائیں اور قرارداد مذمت منظور کی جائیں۔ اس کے بین الاقوامی اجتماعات میں شرکت کے لئے سفر، قیام و طعام کے علاوہ سیر و تفریح کے اخراجات بھی کانگریس کی جانب سے مہیا کئے جاتے۔

کانگریس فار کلچرل فریڈم کے اجتماعات میں اے کے بروہی کے علاوہ مغربی پاکستان کی نمائندگی دو بار جمیل جالبی نے بھی کی۔ یہ اجتماعات پیرس میں منعقد ہوئے تھے۔ جمیل جالبی کب گئے، کب واپس آئے اس کی اطلاع ہمیشہ کانگریس کی رپورٹوں سے یا اخبارات کے ذریعے پاکستان پہنچیں، جالبی سرکاری ملازم ہیں۔ انکم ٹیکس افسر ہیں: "نیا دور" کے نام سے اپنا ایک ادبی رسالہ بھی نکالتے ہیں، پاکستانی کلچر کے عنوان سے ایک کتاب بھی لکھی ہے۔ جو غالباً کلچرل فریڈم سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے۔ اس میں جس کلچرل کی وکالت کی گئی ہے وہ یوپی اور دہلی کا انحطاط پذیر جاگیردارانہ کلچر ہے۔ پاکستان کے لئے انہوں نے کلچر کا یہی نسخہ تجویز کیا ہے لیکن کلچرل فریڈم کے اجتماعات میں مشرقی پاکستان کی نمائندگی عام طور پر علی احسن کرتے تھے یا علی اشرف یا ان کا کوئی گرگا۔

غرضیکہ یہی وہ اسباب تھے۔ جن کے باعث ڈاکٹر علی اشرف کو امریکہ جانے کی اجازت نہ مل سکی۔ اس آڑے وقت میں ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی ان کے کام آئے انہوں نے ذاتی ضمانت فراہم کی۔ حکومت کو ہر طرح علی اشرف کی حب الوطنی کا یقین دلایا۔ بتایا جاتا ہے کہ اس سلسلے میں حکومت کو ڈاکٹر قریشی نے جو سفارشی خط لکھا اس میں یہاں تک یقین دلایا کہ "میری (ڈاکٹر قریشی) وطن پرستی پر اگر شبہ کیا جا سکتا ہے تو علی اشرف پر بھی شک کیا جا سکتا ہے"۔ ڈاکٹر قریشی جولائی تک شیخ الجامعہ تھے۔ لہٰذا ان کی سفارش اور ضمانت کام کر گئی، علی اشرف امریکہ گئے۔ مجلس مذاکرہ میں شرکت کی اور پھر پاکستان واپس آنے کی بجائے لندن پہنچ گئے، ان کو واپس بلانے کے لئے بار بار خطوط لکھے گئے۔ لیکن انہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ اب وہ نام نہاد "بنگلہ دیش" کے لئے لندن میں بیٹھ کر کام کرتے ہیں، ان کے بال بچے بھی ان کے ساتھ لندن میں ہیں، وہ کس طرح وہاں پہنچے؟ یہ ابھی تک راز ہے۔ سنا ہے اس معاملے کی سرکاری سطح پر تحقیقات ہو رہی ہے جس کی روشنی میں بہت سے دلچسپ انکشافات کی توقع ہے۔

بتایا جاتا ہے کہ ڈاکٹر قریشی کو شیخ الجامعہ کے عہدے

باقی صفحہ ۳۴ پر ملاحظہ فرمائیں

علّامہ علاؤ الدّین کو سبکدوش کر دیا جائیگا

نمائندہ خصوصی

پنجاب کے ایک سرکاری ترجمان نے انکشاف کیا ہے کہ پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر علامہ علاؤ الدین صدیقی کو ماہِ رواں کے دوران سبکدوش کر دیا جائیگا۔ اُن کے جانشین کے طور پر متوقع وائس چانسلروں میں پروفیسر نامدار خاں سیکرٹری ایجوکیشن حکومتِ پنجاب اور خواجہ محمّد اسلم پرنسپل اسلامیہ کالج سول لائنز لاہور کے نام چانسلر پنجاب یونیورسٹی کے زیرِ غور ہیں۔

معلوم ہُوا ہے کہ حکومتِ پنجاب نے یونیورسٹی میں بڑھتی ہُوئی بدعنوانیوں، مختلف شعبوں میں دھاندلیوں' اور وائس چانسلر کی کمزور قوتِ فیصلہ کی جانب یونیورسٹی کے چانسلر لفٹیننٹ جنرل عتیق الرحمان کی توجہ مبذول کرائی۔ جس کے نتیجے میں علامہ علاؤ الدین صدیقی کو وائس چانسلر کے عہدے سے سبکدوش کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔

وائس چانسلر کے بارے میں یہ بات پایۂ ثبوت تک پہنچ چکی ہے کہ اُن کی حیثیت دستخط کرنے والی ایک مشین سے زیادہ نہیں۔ اہم امور پر بھی یونیورسٹی کے موجُودہ رجسٹرار جناب شمشاد حیدر کی رائے آخری اور حتمی ہوتی ہے۔ ان حالات میں اساتذہ اور طلبہ کی شکایات میں نہ صرف اضافہ ہُوا ہے بلکہ یونیورسٹی گروہی تنازعات کا اکھاڑہ بن کر رہ گئی ہے۔ وہ اساتذہ جو کسی زمانے میں یونیورسٹی سے منسلک رہے ہیں اب اپنی ریٹائرڈ زندگی کے ایام یونیورسٹی کے معاملات میں براہِ راست مداخلت کر کے گزار رہے ہیں۔ تاکہ وہ وائس چانسلر کے اعصاب پر اثر انداز ہو کر پہلے سے کہیں زیادہ فائدہ اُٹھا سکیں۔ علاّمہ علاؤ الدّین صدیقی پر اُن کا یہ حربہ کافی کامیاب ثابت ہُوا ہے۔ وہ علاّمہ صاحب کے اعصاب پر ہی سوار نہیں ہوئے بلکہ وہ اپنی مرضی اور منشاء کے مطابق کام کرواتے ہیں۔

ادھر موجودہ رجسٹرار جناب شمشاد حیدر کی ذات کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ وہ یونیورسٹی نیو کیمپس کے لاکھوں روپے کے غبن کے مشہور کیس کے ایک اہم ملزم ہیں۔ اس زمانے میں موصُوف پنجاب یونیورسٹی کے خازن تھے۔ اب یہ بات دوسری ہے کہ اُن کے خلاف کارروائی اور محاسبے کے بجائے رجسٹرار کے منصب پر فائز کر دیا گیا اور ان حالات میں انھیں وائس چانسلر علاّمہ علاؤ الدّین صدیقی ملے جنھیں وہ پورے طور پر قابو میں کئے ہُوتے ہیں۔

"الفتح" عنقریب پنجاب یونیورسٹی کے بارے میں وائٹ پیپر شائع کریگا۔ جس میں علاّمہ علاؤ الدّین صدیقی کے دَورِ وائس چانسلری کے کارنامے تفصیلاً درج ہوں گے —— (ادارہ)

الفتح

برطانیہ اپنے بنگلہ دیش آئرلینڈ میں کیا کر رہا ہے؟

آئرلینڈ کے تنازعے کا تاریخی اور سیاسی پس منظر

وہاب صدیقی

یہ ۱۰ راگست ۱۹۷۱ء کی شب ہے رات کا قافلہ اپنی آخری منزل طے کر رہا ہے شمالی آئرلینڈ کے باشندے خواب غفلت کے مزے لوٹ رہے ہیں شہر، بازار اور گلیاں سنسان ہیں۔ صبح صادق کے آثار آہستہ آہستہ نمودار ہو رہے ہیں۔ بلفاسٹ میں گھڑیال نے ساڑھے چار کا اعلان کیا۔ گھڑیال کی گونج کے ساتھ ہی فضا کا سکوت فوجیوں کے بھاری بوٹوں اور گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے چکنا چور ہو گیا۔ برطانوی فوجیوں کی ٹھوکریں گھروں کے دروازوں پر پڑیں۔ بندوق کے کندوں سے دروازے توڑ ڈالے۔ فوجی آئرلینڈ کے باشندوں کی خواب گاہوں میں گھس گئے۔ اور مردوں کو گرفتار کر لیا۔ فوج کے خاص نشانے پیپلز ڈیموکریسی اور ری پبلکن تحریک کے لیڈروں کے گھر تھے فوج نے کسی وارنٹ کے بغیر انہیں گرفتار کر لیا۔ بعض رہنما اپنے گھروں میں موجود نہیں تھے تو ان کے بھائیوں اور رشتہ داروں کو زیر حراست لے لیا گیا۔ پیپلز ڈیموکریسی کا ایک رہنما نیل ڈیلی پچھلے دروازے سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ تو فوج نے اس کی بہن کے ایک انگریز دوست کو گرفتار کر لیا اور کہا ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ۱۷ سال سے ۶۰ سال کی عمر تک کے لوگوں کو گرفتار کر لیا جائے"۔ فوجیوں نے نیل ڈیلی کی بیوی اور بہن سے بے تمیزی کی اور نارروا برتاؤ اختیار کیا۔ اور خوف و ہراس پھیلانے کے لئے دروازے اور کھڑکیاں توڑ پھوڑ دیں۔

رائل آسٹر پولیس نے دیہی علاقوں کے ری پبلکن لیڈروں کو گرفتار کرنے کا حکم دے دیا۔ دیہی پولیس ری پبلکن سے پہلے ہی خار کھاتی تھی، چنانچہ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پولیس نے اپنے پرانے بدلے لئے۔

سترہ (۱۷) سے ساٹھ (۶۰) برس تک کے تمام لوگوں کو گرفتار کرنے کا حکم

بلفاسٹ کی حوالات میں لوگوں کو کس طرح ظلم و تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ اس کی ہلکی سی جھلک جان وائٹ کے ایک بیان سے ملتی ہے۔ جان وائٹ کو اب رہا کر دیا گیا ہے لیکن اس کی کڑی نگرانی ہو رہی ہے۔ اس نے بتایا کہ "فوج اور پولیس کو اسپیشل پاور ایکٹ ۱۹۲۲ء اور ۱۹۳۳ء کے تحت وسیع اختیارات دے دیئے گئے ہیں۔ مجھے آئرش ری پبلکن آرمی کے بارے میں اطلاعات مہیا کرنے پر مجبور کیا گیا۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا تو مجھے ایک ہیلی کاپٹر میں بٹھا دیا گیا۔ بہت بلندی پر جاکر مجھے بتایا گیا کہ "ہم سینکڑوں فٹ بلندی پر پرواز کر رہے ہیں اور اب تمہیں سمندر میں پھینک دیا جائے گا"۔ لیکن اب بھی میں نے اپنی زبان نہ کھولی تو مجھے ایک تھیلے میں بند کر کے نیچے لٹکا دیا گیا۔ تھیلا زمین سے صرف چار فٹ بلند تھا۔ لیکن فوج کا یہ حربہ بھی کامیاب نہ ہو سکا۔ اس پر مجھے دوبارہ حوالات میں بند کر دیا گیا۔ حوالات میں، میں نے کئی ایسے فوجیوں کو دیکھا جو چھڑیوں سے قیدیوں کو مار رہے تھے۔ بعض پولیس اور فوج والے کچھ قیدیوں کو ننگے پیر شیشے کے ٹکڑوں پر چلنے پر مجبور کر رہے تھے"۔ اس بات کا ثبوت قیدیوں کے کٹے ہوئے اور زخمی پیروں سے ملتا ہے جو بعد میں رہا کر دیئے گئے۔ یہ الگ بات ہے کہ برطانیہ کے بورژوائی پریس نے اس بات کو چھپا لیا۔

جان وائٹ نے مزید بتایا کہ "زیرِ حراست افراد کو فوجیوں کا بچا کھچا کھانا بارہ گھنٹے میں ایک مرتبہ دیا جاتا۔ جب کہ وہ بھوک سے نڈھال ہو کر گر پڑتے، قیدیوں کو سونے نہیں دیا جاتا تھا، فوجی حوالات کی چھت پر پاؤں مار مار کر چلتے، چھت ٹین کی بنی ہوئی تھی۔ اتنا شور ہوتا کہ آنکھ لگ ہی نہیں سکتی تھی۔ آئرش ری پبلکن آرمی سے متعلق بار بار سوالات کئے جاتے، اور رشوت کی پیش کش کی جاتی۔ گرفتار شدہ لوگوں کے لواحقین کو کسی قسم کی اطلاع مہیا نہیں کی جاتی تھی"۔

اس فوجی کارروائی کی وجہ حکومت برطانیہ نے یہ بتائی ہے کہ فوج نے آئرش ری پبلکن آرمی نامی ایک تنظیم کی چند دستاویزات پر قبضہ کیا۔ جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ جمہوریہ آئرلینڈ کی بعض تنظیموں کے اشتراک سے شمالی آئرلینڈ کو برطانیہ سے الگ کرنا چاہتی تھی۔ نام نہاد آزاد ریڈیو بی بی سی کے مطابق فوج نے کئی ماہ تک شب و روز محنت سے علیحدگی پسندوں کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ اور پھر انہیں اچانک گرفتار کر لیا۔ لیکن یہ دعویٰ انتہائی مضحکہ خیز ہے۔ بچہ بچہ جانتا ہے کہ آئرلینڈ کی عوامی تحریک کے قائد کون ہیں۔ ہر شخص ان کے نام اور حلیے سے واقف ہے۔ کیونکہ وہ ری پبلکن پارٹی کے عہدیدار ہیں جیسا کہ آفیشل سن فین کے صدر مسٹر تھامس میک گیولا نے کہا ہے "عوامی تحریک کی قیادت کسی سے پوشیدہ نہیں ہے وہ ری پبلکن پارٹی کے لیڈر ہیں، ان کی گرفتاری میں کسی خفیہ سراغرسانی کو دخل نہیں کیونکہ انہیں، ان کے دفتروں یا جلسوں سے خطاب کرتے ہوئے بھی گرفتار کیا جا سکتا تھا"۔

برطانیہ کے سرمایہ دار پریس نے فوج کے ظلم و تشدد کو چھپایا ہے اور فوجی اقدام کی حمایت کی۔ "ڈیلی مرر" لکھتا ہے۔ "ہر حکومت کو سڑک پر بہنے والے بیگناہ خون کا بدلہ لینا چاہئیے" اس نے آئرلینڈ کی عوامی تحریک کو علیحدگی کی تحریک قرار دیا اور تمام تر ذمہ داری آئرش ری پبلکن آرمی پر ڈال دی۔ کیا شمالی آئرلینڈ کے عوامی رہنما "غدار" اور تخریب کار ہیں؟ ضروری ہے کہ اس مسئلے پر کچھ کہنے سے پہلے آئرلینڈ کی تحریک کے پس منظر کو سمجھ لیا جائے۔

آئرلینڈ کا رقبہ تیس ہزار ۷۴ ۵ مربع میل اور آبادی ساڑھے چوالیس لاکھ کے لگ بھگ ہے، یہ جزیرہ برطانیہ کے مغرب میں واقع ہے۔ اب سے کوئی آٹھ، نو سو برس قبل آئرلینڈ ہندوستان کی طرح چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم تھا۔ یہ ریاستیں آپس میں برسرِ پیکار رہتیں، ہر بادشاہ دوسری ریاست کو ہڑپ کرنے میں لگا رہتا، توسیع پسندی کے جذبے نے ہندوستان کے نوابوں کی طرح انہیں بھی برطانیہ سے مدد لینے پر اکسایا۔ برطانوی نوآبادکار تو ایک مدت سے اس موقع کی تلاش میں تھے۔ چنانچہ اس نے آئرلینڈ کے نوابوں کو فوجی امداد دی اور ایک بادشاہ کو دوسرے بادشاہ کے خلاف صف آرا کیا۔ اس طرح برطانیہ کا اثر و رسوخ

اسپیشل پاور ایکٹ ـــــ ۱۹۲۲ء اور ۱۹۳۳ء

- پولیس کسی بھی شخص کو شک کی بنیاد پر وارنٹ گرفتاری کے بغیر بھی گرفتار کر سکتی ہے۔
- پولیس یا شاہی فوج کے معمولی سے سپاہی کو بھی تحقیقات کا اختیار حاصل ہے۔ اس کے کسی سوال کا جواب نہ دینا سنگین جرم ہے۔
- پولیس کو عدالت کا جاری کردہ پروانہ حاضری منسوخ یا معطل کرنے کا اختیار ہے۔
- وزیر داخلہ کسی بھی فرد کو دولتِ مشترکہ کے چھ ملکوں سے جلا وطن کر سکتا ہے۔
- وزیر داخلہ اظہارِ وجوہ کے بغیر کسی بھی شخص کو غیر معینہ مدّت کے لئے زیرِ حراست رکھنے کا حکم دے سکتا ہے۔
- اخبارات، فلموں، گراموفون ریکارڈ، مخصوص علامتوں، نشانات، جھنڈوں اور رنگوں پر پابندی لگائی جا سکتی ہے۔
- کسی بھی جلسے، اجتماع اور جلوس کو غیر قانونی قرار دیا جا سکتا ہے۔
- حکومت کو تمام اقسام کی املاک کی تلاشی، ضبط اور تباہ کرنیکا اختیار ہے۔
- انتظامیہ یا پولیس، کسی بھی فرد کی ہلاکت کی عدالتی تحقیقات معطل یا ختم کرانے کا اختیار رکھتی ہے۔
- اس ایکٹ کے تحت پولیس کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ کسی فرد کی ہلاکت کی اطلاع حاکمِ شہر کو نہ دے۔

برطانیہ نے شمالی آئرلینڈ کو اپنی کالونی بنالیا ھے



برطانوی سپاہی بلفاسٹ کے ایک شہری کو زدوکوب کر رہا ہے

بڑھتا رہا۔ اور آہستہ آہستہ مختلف حیلوں اور بہانوں سے ہندوستان کی طرح برطانیہ نے آئرلینڈ پر قبضہ کر لیا۔ آئرلینڈ پر تسلط جمانے کے بعد برطانوی نوآبادکاروں نے یہاں بھی استحصال شروع کر دیا۔ بلکہ اس نے یہاں کے عوام پر پروٹسٹنٹ عقیدے کو ٹھونس چاہا تاکہ اگر یہاں کے عوام پروٹسٹنٹ عقیدہ قبول کر لیں، تو وہ ہمیشہ کے لئے اس ملک پر قابض ہو جائے۔ لیکن آئرلینڈ کے عوام شدید دباؤ کے باوجود رومن کیتھولک عقیدے پر قائم رہے، اس پر کرام ویل نے آئرلینڈ کے شمالی حصے سے قدیم اور اصلی باشندوں کو بے دخل کر کے جنوبی حصے میں بھیج دیا۔ اور شمالی حصے کی زرخیز اراضی انگریزوں اور اسکاٹ لینڈ کے پروٹسٹنٹ جاگیرداروں کو دے دی، اس طرح غیر ملکی لٹیرے جاگیردار بن گئے اور زمین کے حقیقی وارث۔ آئرش عوام مزارعین بن گئے۔ جاگیرداروں کی اکثریت برطانیہ اور اسکاٹ لینڈ میں رہتی تھی۔ وہ سال چھ ماہ کے بعد آئرلینڈ جاتے اور مزارعین کی پیدا کردہ دولت سمیٹ کر برطانیہ چلے آتے، ان جاگیرداروں نے اتنی لوٹ کھسوٹ کی کہ مزارعین میں لگان ادا کرنے کی سکت تک نہ رہی، چنانچہ انیسویں صدی میں لاتعداد مزارعین امریکہ چلے گئے تاکہ پیٹ بھر کر روٹی تو مل سکے، لیکن کسانوں کی اکثریت نے اپنے آباؤ اجداد کی زمین کو چھوڑنا گوارہ نہیں کیا۔ انہوں نے اپنے حقوق کے حصول کے لئے جدوجہد جاری رکھی۔ وقتاً فوقتاً مسلح جدوجہد بھی کی اور آزادی کا پرچم بھی بلند کیا، لیکن تنظیمی اور سیاسی شعور کے فقدان کی وجہ سے یہ تحریکات ناکام رہیں۔ فوج کی مدد سے برطانوی جاگیرداروں نے کسانوں کو بری طرح کچل دیا۔ مزارعین کی جدوجہد آزادی کو دبانے کے لئے برطانوی وزیر اعظم گلیڈسٹون

نے ایک اور چال چلی۔ مزارعین کے حقوق کے تحفظ کے لئے کچھ قوانین بنائے تاکہ وہ جدوجہد ترک کر دیں۔ آئرلینڈ کے مزارعین صرف معاشی جدوجہد ہی نہیں کر رہے تھے بلکہ وہ آزادی کا پرچم بھی اٹھائے ہوئے تھے۔ لہٰذا ان کی تحریک آزادی جاری رہی۔

اس صدی کی ابتداء میں جدوجہد آزادی نے مزید زور پکڑا۔ خوش قسمتی سے آئرش عوام کو جیمز کونلی جیسا عظیم انقلابی میسر آگیا۔ اس نے آئرش مزدور رہنما بگ جم لارکن کے اشتراک سے آئرش ٹرانسپورٹ اینڈ جنرل ورکرز یونین بنا کر پرولتاریہ میں طبقاتی جدوجہد کو بڑھایا اور پھر ۱۹۱۳ء میں ملک گیر ہڑتال کر کے مزدوروں میں نوآبادیاتی اور سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف مزید نفرت پھیلائی۔ اور "آئرش سٹیزن آرمی" قائم کی۔ ۲۴ر اپریل ۱۹۱۶ء کو کونلی نے آئرش جمہوریہ کے قیام کا اعلان کر دیا۔ پانچ دن تک برطانوی فوج سے آئرلینڈ کے شہروں اور دیہاتوں میں دوبدو جنگ ہوتی رہی۔ لیکن یہ تحریک وسائل کی کمی کی وجہ سے کامیاب نہ ہو سکی۔ کونلی اور دوسرے انقلابی لیڈروں کو ۱۲ر مئی ۱۹۱۶ء کو گولی سے اڑا دیا گیا۔ لیکن تحریک آزادی تمامتر تشدد کے باوجود دب نہ سکی۔ تو برطانوی حکمران طبقے نے آئرلینڈ میں رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ کا تنازعہ پیدا کر دیا۔ سامراجیوں کی ہر جگہ یہ کوشش رہی ہے کہ وہ اپنی نوآبادی چھوڑتے وقت اس

کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں تاکہ وہ ایک موثر طاقت نہ بن سکے اور ہمیشہ کے لئے ان کے در پر حاضری دیتا رہے۔ آئرلینڈ کے پروٹسٹنٹ عوام کے ذہنوں میں اپنے ایجنٹوں کے ذریعے یہ بات نقش کروا دی کہ اگر "آئرلینڈ" ایک وحدت کی شکل میں آزاد ہو گیا تو تم رومن کیتھولک کے غلام بن جاؤ گے کیونکہ اکثریت ان کی ہے۔ اس لئے آئرلینڈ کی تقسیم کا مطالبہ کرو۔ چنانچہ پروٹسٹنٹ نے مطالبہ کیا کہ ان کی اکثریت شمالی آئرلینڈ کے چھ اضلاع میں ہے۔ یہ ضلع برطانیہ کے زیر اقتدار رہیں۔ کیونکہ برطانوی بھی پروٹسٹنٹ ہے ورہم بھی اس پر سخت احتجاج ہوا قتل و غارت گری ہوئی۔ لیکن ۱۹۲۲ء میں برطانیہ نے آئرلینڈ کو جنوبی اور شمالی آئرلینڈ میں تقسیم کر دیا

جنوبی آئرلینڈ کا رقبہ، ۲۳ ہزار ۱۳۶ مربع میل ہے اور آبادی ۲۹ لاکھ ۲۱ ہزار ہے۔ رومن کیتھولک کا تناسب ۹۵ فی صد اور پروٹسٹنٹ کا ۵ فی صد ہے۔ جنوبی آئرلینڈ کا صدر مقام ڈبلن ہے۔ آزادی کے بعد جنوبی آئرلینڈ دولت مشترکہ کا رکن رہا لیکن جنگ عظیم دوم میں غیر جانبدارانہ پالیسی اختیار کی اور بالآخر ۱۹۴۹ء میں دولت مشترکہ سے الگ ہو گیا اب جنوبی آئرلینڈ "ایریا" یا جمہوریہ آئرلینڈ کہلاتا ہے اس نے ۱۹۳۷ء میں آئرش فری اسٹیٹ کا ایک آئین نافذ کیا۔ جس کی رو سے پورا آئرلینڈ اس کا علاقہ ہے لیکن یہ دستور صرف جمہوریہ آئرلینڈ میں ہی

نافذ العمل ہے۔

شمالی آئرلینڈ جو "السٹر" کہلاتا ہے اس رقبہ ۵۴۵۱ مربع میل اور آبادی پندرہ لاکھ سے کچھ زائد ہے۔ آبادی میں پروٹسٹنٹ کا تناسب ۶۶ فی صد اور رومن کیتھولک کا ۳۴ فی صد ہے۔ شمالی آئرلینڈ کی پارلیمنٹ کا صدر مقام بلفاسٹ ہے۔ یہ پارلیمنٹ صرف مقامی معاملات کی ذمہ داری ہے۔ ورنہ اصل حکومت برطانوی حکمران ٹولے کی ہے برطانوی ہاؤس آف کامنز میں شمالی آئرلینڈ کے بارہ نمائندے ہیں لیکن یہ نمائندے ایک آدمی ایک ووٹ کے تحت منتخب نہیں کئے جاتے، بلکہ ان کی تعداد مقرر ہے۔ اس کے علاوہ برطانیہ شمالی آئرلینڈ کو بالکل اپنی کالونی بنائے ہوئے ہے۔ اعلیٰ سرکاری ملازمتوں پر انگریز فائز کئے جاتے ہیں، زرعی اراضی اور معدنی وسائل پر انگریزوں کا قبضہ ہے۔ عدلیہ اور انتظامیہ پر ان کا تسلط ہے شمالی آئرلینڈ کے عوام کا بُری طرح استحصال کیا جا رہا ہے۔ اس استحصال سے نجات حاصل کرنے کے لئے وہ آئرش ریپبلکن آرمی" میں شامل ہو رہے ہیں ابتدا میں اس آرمی میں رومن کیتھولک کی اکثریت تھی، لیکن اب پروٹسٹنٹ محنت کش بھی، اس میں شامل ہو رہے ہیں۔ برطانوی حکومت "آئرش ری پبلکن آرمی" کو تخریبی جماعت اور تخریب پسند قرار دیتی ہے۔ کیونکہ یہ جماعت شمالی آئرلینڈ کو جنوبی آئرلینڈ کا اٹوٹ انگ قرار دیتی ہے۔ اور اس بات کا مطالبہ کرتی ہے کہ شمالی آئرلینڈ کے عوام ایک الگ قوم ہیں انہیں حق خود اختیاری دیا جائے۔

آئرش ری پبلکن آرمی کا یہی مطالبہ "جرم" بن گیا ہے۔ برطانوی پریس اسے علیحدگی پسندوں کی جماعت قرار دیتا ہے اور حکومت اسے رومن کیتھولک کی نمائندے قرار دے کر پروٹسٹنٹ عوام کو اس کے خلاف اُکساتی ہے۔ چنانچہ دو سال پیشتر فسادات بھی ہوئے لیکن اب طبقاتی شعور بڑھ جانے سے تمام سامراجی حربے ناکام ہو رہے ہیں۔ حق خود اختیاری کا مطالبہ زور پکڑتا جا رہا ہے۔ دنیا کے تمام عوام آئرش عوام کے حق خود مختاری اور علیحدگی کی حمایت کرتے ہیں کیونکہ عظیم لینن نے کہا ہے کہ "حق خود مختاری میں حق علیحدگی بھی شامل ہوتا ہے اور جو لوگ حق علیحدگی مخالفت کرتے ہیں وہ بالکل اُن لوگوں کی طرح ہیں جو حق طلاق کی مخالفت کرتے ہیں"۔

آئرش انقلاب کا بانی ـــ جیمز کونلی

"اگر ہم نے ان لوگوں کے ساتھ نرمی اور ڈھیلے پن کا برتاؤ کیا تو وہ اسے ہماری کمزوری سمجھیں گے۔ جس کا نتیجہ یقیناً تسلی بخش نہ ہوگا۔ یہ مزید پر پُرزے نکالیں گے۔ اس لئے موجودہ سوسائٹی کو ان کی تخریبی سرگرمیوں سے محفوظ رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اس مرحلے پر ان کے ساتھ رواداری اور نرمی کا سلوک نہ کریں۔ اگر اس سے حالات خراب ہوتے ہیں تو ہونے دیں۔ سرغنوں کے ساتھ وہی برتاؤ کیا جائے جس کے وہ مستحق ہیں۔"

یہ آئرش بورژوائی کے ترجمان "آئرش انڈی پینڈنٹ" کے ایک مضمون کا اقتباس ہے۔ جس میں اخبار کے مالک ڈبلیو ایم مرفی نے آئرلینڈ کے عظیم انقلابی جیمز کونلی کے خون کا مطالبہ کیا۔ ۱۹۱۶ء کی انقلابی تحریک کو "عوام دُشمن اور ملک دُشمن تحریک" بتاتے ہوئے اُسے "غداری" قرار دیا۔ اور کونلی اور دیگر مزدور اور انقلابی رہنماؤں کو "غدار اور تخریب پسند عناصر" کا نام دیا۔ برطانوی حکومت اور سرمایہ دار بھی آئرش انقلابی تحریک سے خوفزدہ تھے۔ چنانچہ برطانوی کابینہ نے، جس میں لیبر پارٹی کا بھی ایک نمائندہ شامل تھا۔ کونلی اور دوسرے انقلابی رہنماؤں کی قسمت کا فیصلہ برطانوی فوج پر چھوڑ دیا۔ فوجی حکام نے فردِ جرم عائد کئے، اور صفائی کا موقع دیئے بغیر کونلی اور دو انقلابی لیڈروں کو گولی سے اُڑا دینے کا حکم دے دیا۔ ۱۲ مئی ۱۹۱۶ء کو کونلی اور دیگر انقلابی رہنماؤں کو گولی مار دی گئی۔

جیمز کونلی "غدار" تھا اور نہ "تخریب کار"۔ وہ آئرلینڈ کا عظیم انقلابی تھا۔ پکا کمیونسٹ، پرولتاریہ کا سچا ہمدرد۔ جیمز کونلی ۱۸۶۸ء میں پیدا ہُوا۔ ابتدا ہی سے وہ محنت کشوں کا ہمدرد تھا۔ اُس نے شب و روز کام کر کے آئرلینڈ کے بائیں بازو کو گمنامی اور بے عملی کے دبیز پردوں سے نکال کر ایک موثر اور انقلابی تحریک بنایا۔ آئرش مزدور اور انقلابی رہنما جم لارکن کے ساتھ مل کر آئرش ٹرانسپورٹ اینڈ جنرل ورکرز یونین بنا کر محنت کشوں میں طبقاتی شعور اجاگر کیا۔ اس یونین نے ۱۹۱۳ء میں ملک گیر ہڑتال کی۔ کونلی نے جم لارکن کے رفیقِ خاص کی حیثیت سے اس ہڑتال میں کام کیا اور محنت کشوں کی اس معاشی جدوجہد کو طبقاتی جدوجہد میں ڈھال دیا۔ اس ہڑتال نے "آئرش سٹیزن آرمی" کو جنم دیا۔ جو عظیم لینن کے قول کے مطابق "جدید یورپ کی پہلی سُرخ فوج تھی۔"

۱۹۱۴ء میں پہلی جنگِ عظیم شروع ہُوئی۔ اس سے پُورے یورپ کی انقلابی تحریکیں متاثر ہوئیں۔ پرولتاریہ کی اکثریت نے جنگ کی تباہی اور ہولناکیوں سے بچنے کے لئے اپنے ملک کی بورژوائی سے اتحاد کیا اور شانہ بشانہ جرمنی سے لڑے۔ اس طرح بین الاقوامی پرولتاریہ تحریک تباہ ہو گئی۔ آئرلینڈ کی پرولتاری تحریک بھی متاثر ہُوئے بغیر نہ رہ سکی۔ البتہ آئرش انقلابیوں نے واضح اور کھلے الفاظ میں جنگِ عظیم اوّل کو "سامراجی جنگ" اور "مارکیٹوں کی تقسیم نو کی جنگ" قرار دیا۔ کونلی نے فوجی بھرتی کی سخت مخالفت کی، چنانچہ برطانوی نوآبادکاروں نے "آئرش ورکرز" کو غیر قانونی قرار دے دیا۔ لارکن مایوس اور بددل ہو کر دسمبر ۱۹۱۴ء میں امریکہ چلا گیا۔ لارکن کے بعد انقلابی تحریک کی قیادت کونلی کے ہاتھوں میں آ گئی۔ اس نے بحسن خوبی انقلابی تحریک کو آگے بڑھایا۔ ٹریڈ یونین ازم میں حصّہ لینے کی بجائے اس نے "آئرش سٹیزن آرمی" کو منظم کیا۔ اور نعرہ لگایا کہ "ہم تاجِ برطانیہ یا قیصر کے لئے نہیں لڑیں گے، ہمارے نزدیک دونوں ایک جیسے ہیں۔" مئی ۱۹۱۵ء میں کونلی نے محنت کشوں کا ترجمان "دی پبلک ورکرز" جاری کیا۔ یہ رسالہ پرولتاری کا حقیقی ترجمان تھا۔ جنگِ عظیم اوّل کی وجہ سے یورپ کے تمام مزدور لیڈر طبقاتی جدوجہد کو چھوڑ کر جنگ میں سرمایہ داروں کی حمایت کر رہے تھے۔ لیکن کونلی کے اخبار نے پرولتاری سیاست اور حکمتِ عمل کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا اور طبقاتی جدوجہد پر زور دیتا رہا۔ اُس

باقی صفحہ ۲۸ پر ملاحظہ فرمائیں



پاکستان آرٹس کونسل

جواں سال آرٹسٹوں کی قتل گاہ

نعیم آروی

کچھ دنوں پہلے وائی ایم سی اے کے ایک کمرہ میں ایک آرٹسٹ نظر آیا۔ بتایا گیا، کہ بڑے کانٹے کا مصور ہے۔ راولپنڈی سے کراچی آیا ہے۔ سن رکھا تھا کہ اس شہر میں فن کاروں کو ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے رستم علی کیانی روڈ پر آرٹ اور کلچر کی ترویج و ترقی اور نئے فنکاروں کی حوصلہ افزائی کے لئے ایک جہاز نما محل تعمیر کیا گیا ہے۔ جہاں ثقافتی شو اور پینٹنگز کی نمائش کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ سادہ لوح فن کار اس خیال سے کھنچا چلا آیا۔ وہ یہاں ہفتوں مہینوں کراچی آرٹ کونسل کا طواف کرتا رہا۔ شہر کی خاک چھانتا رہا۔ مگر کسی نے غریب فن کار سے پوچھا تک نہیں کہ تیرے موئے قلم سے کس طرح لکیروں اور رنگوں کی دنیا انگڑائی لے کر بیدار ہوتی ہے ؟ بے چارہ مصور آرٹ اور کلچر کے "برہمنوں" کے سنگدلانہ رویئے سے دل برداشتہ ہوکر یورپ بھاگ نکلا۔ وہاں اُسے سب کچھ ملا، جس کی آرزو اس کے دل میں انگڑائی لیتی تھی۔ ۱۹۶۵ء میں اپنے دامن میں بین الاقوامی شہرت سمیٹے ہوئے کراچی آیا اور اپنا اسٹوڈیو آرٹس کونسل کے مقبرے میں قائم کرنے کی بجائے تاج ہوٹل میں قائم کیا۔ مصور نے سوچا تھا کہ وہ مصوری کی دنیا میں ہلچل مچادے گا۔ پاکستان کا نام روشن کرے گا۔ فن کو عوام کی زندگی سے قریب لے آئے گا لیکن ایک بار پھر فن و ثقافت کے ٹھیکیداروں کے مخاصمانہ اور سنگدلانہ سلوک سے مایوس ہوکر امریکہ چلا گیا۔ لیکن وہاں اُسے چین نہ آیا۔ مصوری کے ذریعے عوام اور ملک کی خدمت کرنے کا جذبہ موجزن تھا۔ وطن کی محبت اُسے ایک بار پھر کراچی لے آئی۔ اس نے اپنے لئے وائی ایم سی اے کا وہی کمرہ منتخب کیا جہاں سے اس نے اپنے سفر کا آغاز کیا تھا۔ اس دوران کراچی آرٹس کونسل کے ٹھیکیدار خاموشی سے اس المیئے کا تماشہ دیکھتے رہے۔

اس مصور کا نام احمد پرویز ہے جو اپنے وطن میں بے قدری کا شکار رہا۔ لیکن جسے بیرون ملک ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ عزت اور مرتبہ سے نوازا گیا۔

ایک مصور احمد پرویز ہی نہیں ایسے کئی مصور ملیں گے جن کے فن کو آرٹس کونسل کے سرپرست نہایت بیرحمی سے کچلتے رہے ہیں۔ فن و ادب کی تاریخ میں یہ

آرٹس کونسل۔ مقامی فنکاروں کی خدمت کے لئے قائم نہیں ہوئی

ایک روایتی مرحلہ ہے۔ لیکن اسے اس لئے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ یہ ٹھیکیدار اپنے آپ کو پڑھا لکھا' آرٹ اور کلچر پر بزعم خود اتھارٹی ہونے کا دعویٰ بھی کرتے ہیں۔ ان کے مخصوص مفادات ہیں، مخصوص سوچ ہے۔ آرٹ اور کلچر پر ٹھیٹ جاگیردارانہ تسلّط کے قائل ہیں۔ اس لئے ان کے نزدیک فن کے کسی بھی شعبے سے تعلق رکھنے والا نووارد فنکار پذیرائی کے قابل نہیں ہوتا۔ ٹھوکریں کھانے کے لئے اللہ کی پوری زمین کھلی پڑی ہے ضروری تو نہیں کہ ہر فنکار کا خیر مقدم کراچی آرٹس کونسل کے گیٹ پر کیا جائے۔ چنانچہ گیٹ والیسی کے مصوروں میں کالج آف آرٹس، ڈھاکہ کے فارغ التحصیل مبین العظیم بھی آتے ہیں۔ ۱۹۵۶ء میں کراچی میں وارد ہوئے۔ خیال و خواب کی ایک رنگین دنیا سجائے ہوئے آرٹس کونسل کی عمارت میں داخل ہوئے۔ لیکن جب اس مقبرے سے باہر نکلے، تو رنگین خیالوں کے سارے سنہرے پر جھڑ چکے تھے۔ ان کے دامن میں مایوسی اور شکست کے کانٹے چبھے ہوئے تھے۔ انہوں نے کراچی آرٹس کونسل کی بلند و بالا عمارت کو حسرت بھری نظروں سے دیکھا اور اس جگہ سے روانہ ہوگئے۔ اپنے پینٹنگ کو پچھلے پر رکھا اور کراچی کی بارونق، فیشن ایبل سڑکوں پر پھیری لگانے کے لئے نکل آئے۔ امریکی کلچر سنٹر والے ایسے موقع کے منتظر ہوتے ہیں نوجوان آرٹسٹ کو اپنے ساتھ لے گئے اور ۱۹۶۱ء میں پہلی بار ان کی تصاویر کی نمائش کا انتظام کروایا۔ اس کے بعد ۱۶ مرتبہ اسی مصور کی بنائی ہوئی تصاویر کی کامیاب نمائش ہوئی۔ آرٹس کونسل والوں نے جب دیکھا کہ یہ مصور تو ان کی امداد اور تعاون کے بغیر ہی شہرت کے آسمان پر اُڑا جا رہا ہے تو کچی نیند سے جاگے۔ ۱۹۶۴ء میں جیسے تیسے ایک سولو شو کا انتظام کیا اور اپنے دامن کے دھبے صاف کرنے کی بے سود کوشش کی گئی۔

احمد پرویز، مبین العظیم کے علاوہ نیشنل کالج آف آرٹس کے گریجویٹ رشید احمد راشد، جمیل احمد، جمیل نقش، منصور ائے زبیری بسمل، منصور راہی، اور بشیر مرزا جیسے ذہین، منفرد اور قابل قدر مصور کراچی آرٹس کونسل کے ناخداؤں کے ہاتھوں اپنا جسم اور اپنی روح لہولہان کر چکے ہیں۔ ان تمام فنکاروں کو کونسل کی سرپرستی سے قصداً محروم رکھا گیا۔ انہیں کسی قسم کی امداد فراہم نہ کی گئی جو اُبھرتے ہوئے فنکاروں کی ہمت افزائی کے لئے ضروری سمجھی جاتی ہے۔ یہاں تک آرٹس کونسل میں ان کی تصاویر کی نمائش کی اجازت بھی نہ دی گئی۔ نوجوان مصور آرٹس کونسل کے کرتا دھرتا ٹھیکیداروں کے رویئے سے مایوس نہ ہوئے انہوں نے نجی طور پر اپنی نمائش کا انتظام کیا۔ ان میں سے کچھ مصور امریکی کلچر سنٹر والوں کے ہتھے بھی چڑھ گئے۔ باہر والوں نے اپنے طور پر نمائش کا انتظام کیا۔ دیکھنے والوں نے دیکھا اور مصوروں کی کاوش اور فنی صلاحیتوں پر بر جی کھول کر داد دی۔

اس پر کونسل والوں کی غیرت جاگی اور ان میں سے چند مصوروں کے فن کی نمائش کرا ڈالی۔ ۱۹۶۷ء میں نوجوان مصور جمیل نقش کی ایک نمائش آرٹس کونسل میں منعقد ہوئی۔ مگر اس نمائش کا انتظام اس قدر نیم دلانہ تھا کہ مصور کا ایک شاہکار بھی فروخت نہ ہو سکا۔ کونسل کی اس بدانتظامی اور لاپرواہی سے مصور کا دل خون ہوا اور اس نے طے کر لیا کہ آئندہ وہ محض اپنی روح کی آسودگی اور فنکارانہ جذبے کی تسکین کے لئے تصویریں بنائے گا۔

جمیل احمد معمولی گھرانے کا مصور تھا۔ جھگی میں رہتا تھا۔ آرٹس کونسل والوں کی آنکھیں گدڑی میں چھپے لعل کو نہ دیکھ سکیں۔ ایک غیر ملکی خاتون نے کیچڑ میں اُگے ہوئے اس پھول کو دیکھا اور اُسے اُٹھا کر صاف ستھری جگہ میں سجا دیا۔ کونسل کے نگہبانوں نے پرولتاری طبقے سے تعلق رکھنے والے جمیل احمد کو نظر انداز کر دیا۔ ان کے نزدیک اس طبقے کا کوئی فرد مصور بننے کا حق نہیں رکھتا۔ اس لئے اس بے آسرا فنکار کو ٹھکرا دیا گیا۔ جبکہ ۱۹۶۰ء میں اس کی پہلی نجی نمائش نے ثابت کر دیا کہ اس میں ایک کامیاب مصور چھپا ہوا تھا۔ اور جو موقع ملتے ہی باہر نکل آیا۔ اس کے بعد پاکستان کے کئی شہروں میں اس کی تصاویر کی ۱۱ کامیاب نمائشیں ہوئیں۔

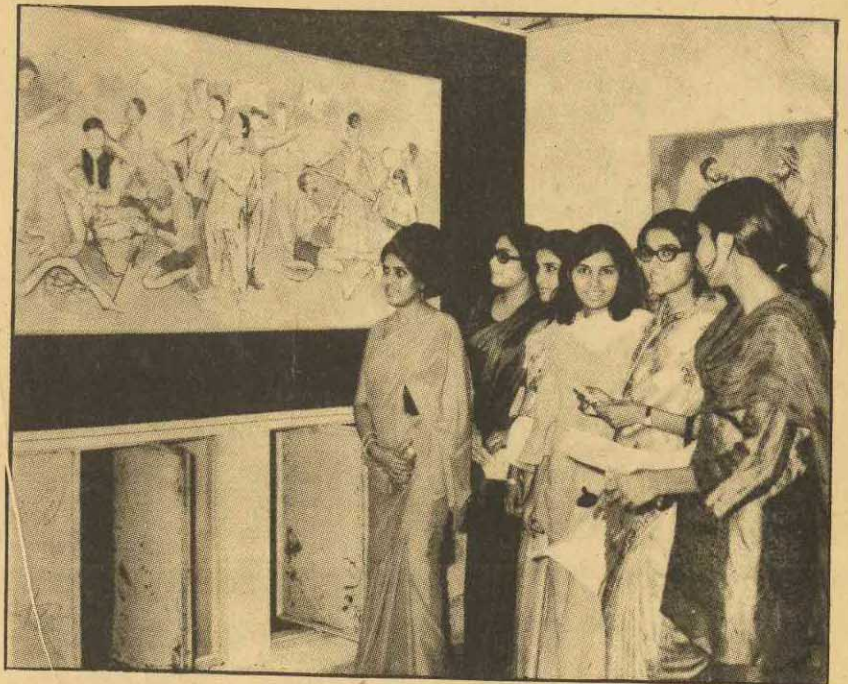
جب وہ ملکی سطح پر شہرت حاصل کر چکا تو کونسل والوں کی مُندی مُندی آنکھیں یکبارگی کھل گئیں، اور جلدی جلدی ایک سولو شو کا انتظام کیا گیا۔ ۱۹۷۰ء میں کونسل کی طرف سے اس کی تصاویر کی نمائش بدانتظامی کا شکار رہی اور ایک تصویر بھی فروخت نہ ہو سکی۔ آرٹس کونسل کے ہاتھوں صادقین پر بھی کیا کچھ نہ بیت گئی۔ کونسل کے ہال اس بات کے گواہ ہیں۔

رشید احمد راشد جو نیشنل کالج آف آرٹس لاہور کے گریجویٹ ہیں آرٹس کونسل میں ان کی تصاویر کی ایک نمائش نہ ہو سکی۔ کونسل والے انہیں اس کا اہل نہیں جانتے۔ حالانکہ انہیں کونسل کے زیر انتظام سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف آرٹس اینڈ کرافٹس کا پرنسپل بنا دیا گیا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر وہ اس لائق نہیں ہیں تو پھر انہیں سنٹرل انسٹی ٹیوٹ کا پرنسپل کیوں بنا دیا گیا ہے؟ اس ایک سوالیہ جملے میں اسرار و رموز کا ایک دریا موجزن ہے۔ اگر اس کی تحقیقات کی جائے تو بے شمار ایسے گوشے برآمد ہوں گے جس پر کونسل کے اجارہ داروں نے پردے ڈال رکھے ہیں۔ مصور راشد نے کئی بار صرف چند دنوں کی نمائش کی اجازت مانگی۔ مگر انہیں اس خوف سے اجازت نہ دی گئی کہ کہیں راشد کی نمائش سے کونسل کا بلند معیار مجروح نہ ہو جائے۔ اس کے برعکس اسی اسکول سے تعلق رکھنے والی ایک سابق سیکرٹری کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اس کی پینٹنگ کی نمائش کا انتظام کیا گیا۔ مصور خاتون ہیں۔ نمائش کے موقع پر کئی رنگوں کے کارڈ چھپوا کر تقسیم کرائے گئے۔

پاکستان کے مقبول اور ممتاز مصور صادقین کو بھی اس منزل تک پہنچنے کے لئے اپنے نجی ذرائع پر بھروسہ کرنا پڑا۔ انہیں اب سے پہلے کونسل والوں کی طرف سے کبھی تعاون حاصل نہیں رہا۔

کراچی آرٹس کونسل کے نام نہاد ٹھیکیداروں کے شکنجے میں جو آیا کسا گیا۔ مصوروں کے علاوہ ڈرامہ نگاروں کا بھی قتل عام کیا گیا۔ ضیا محی الدین، خواجہ معین الدین، علی احمد اور اطہر علی سب کے سب

۷۰ ہزار کی سرکاری
گرانٹ سے صرف
عملے کی تنخواہیں
نکل سکتی ہیں



ایوانِ قراش کا پُراسرار سکینڈل ابھی تک سربستہ ہے

اس قتل گاہ سے مجروح نکلے - ملک کو ان ذہین فنکاروں پر ناز ہے - اسٹیج ڈرامہ کو ترقی دینے اور عوام میں مقبول بنانے میں یہ حضرات ہمیشہ پیش پیش رہے مگر کونسل کے برہمنوں کو ان کی صلاحیتوں پر ہمیشہ شبہ رہا - اور ان کی ہر طرح حوصلہ شکنی کی گئی!

فنکاروں اور مصوروں کے ساتھ آرٹس کونسل کے نام نہاد عہدیداروں کے اس استحصالی رویئے کو دیکھتے ہوئے خود بخود سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس کونسل کے قیام کا مقصد کیا ہے؟

کراچی آرٹس کونسل کا مقصد آرٹ اور کلچر کی ترویج و ترقی میں ایک اہم کردار ادا کرنا ہے - یا اُبھرتے ہوئے فنکاروں کی حوصلہ شکنی کر کے، فن اور ثقافت کو کچلنا اور تباہ کرنا ہے؟

اس سوال کا جواب تلاش کرنے کے لئے ہمیں اس کے قیام اور اس کے اغراض و مقاصد پر سرسری نظر ڈالنی ہوگی - یہ اس لئے بھی ضروری ہے تاکہ ہم کونسل کے منشور کی روشنی میں کراچی آرٹس کونسل کی ۱۵ سالہ کارکردگی کا منصفانہ جائزہ لے سکیں - اور ان کا اصل مقام تعین کر سکیں، جو عرصہ دراز سے آرٹ اور کلچر کے ٹھیکیدار بنے ہوئے فن اور فن کار دونوں کا خون کر رہے ہیں -

اغراض و مقاصد جن سے روگردانی کی گئی

کونسل کے چلانے والوں نے دستور کی ایک بھی شرط پوری نہیں کی - جبکہ دستور میں حسب ذیل اغراض و مقاصد کے حصول کا ذکر کیا گیا ہے -

الف - آرٹس کونسل نے دستور کے مطابق فن، کرافٹ، تھیٹر، رقص اور موسیقی کو ترقی دینے میں کوئی کام نہیں کیا - نہ ہی کلچر کانفرنس، کنسرٹ اور پبلیکیشن ہی کی ضرورت آج تک محسوس کی گئی - اُلٹا یہ پروپیگنڈا کیا جاتا رہا ہے کہ پاکستان کے عوام آرٹ اور کلچر سے ذرا برابر دلچسپی نہیں رکھتے - جس کا مطلب ہوا کہ وہ "غیر مہذب" اور "وحشی" ہیں -

(ب) کراچی آرٹ گیلری کے ساتھ آرٹ مرکز، تھیٹر اور لائبریری کے قیام کے مطالبے کو نظر انداز کیا گیا جس نے ان چیزوں کا مطالبہ کیا، اسے معتوب کیا گیا -

ج - کونسل کے مقاصد کو آگے بڑھانے کے لئے آج تک فنون لطیفہ پر کوئی جریدہ، کتاب یا پمفلٹ شائع نہیں کیا گیا -

د - فن کاروں کو کسی قسم کی امداد فراہم نہیں کی گئی بلکہ فن کاروں کو وحشیانہ طریقے سے تباہ کرنے کی سازش کی گئی -

ہ - کونسل کے زیر انتظام میوزیکل کنسرٹ اور نمائشیں مالی اعتبار سے فلاپ ثابت ہوئیں - جس کی سب سے بڑی وجہ کونسل کی بد انتظامی رہی ہے - اس سے فنکاروں کی زبردست حوصلہ شکنی ہوئی ہے اور ثقافتی سرگرمیوں کے فروغ میں یہ چیز ہمیشہ مانع رہی ہے،

و - کونسل نے ایسی تنظیموں سے عملی اشتراک قائم کرنے میں روایتی ڈھیلے پن کا ثبوت دیا جو فنون لطیفہ کو فروغ دینے میں کوشاں ہیں -

کونسل کی سرگرمیوں کی تاریخ ملاحظہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ کونسل کے چودھریوں نے فنون لطیفہ کو فروغ دینے کی بجائے اپنی گرہ کو مضبوط کیا - اپنے سٹاف کی تنخواہوں کی ادائیگی میں زیادہ دلچسپی دکھائی گئی - الٹی سیدھی سرگرمیوں کے ذریعہ نصف درجن بوگس شعبے کھول دیئے گئے جو صرف کاغذ پر موجود ہیں -

کونسل کراچی کے عوام کے نام پر حکومت سے پچھلے کئی سالوں سے لاکھوں روپے کا گرانٹ وصول کر رہی ہے - اس گرانٹ میں زبردست گھپلے کئے جا رہے ہیں - فنون لطیفہ کے نام نہاد ۳۶۱ چودھریوں کی ناجائز خواہشات پر گرانٹ کا روپیہ پانی کی طرح بہایا جا رہا ہے -

کونسل کے عہدیدار اپنے مقصد کے حصول کے لئے اپنے عہدے سے ناجائز فائدہ اُٹھا کر بااثر لوگوں سے میل جول بڑھاتے ہیں تاکہ بُرے وقت میں بااثر لوگ ان کی حفاظت کر سکیں - کونسل کے ایک عہدے دار کو اکثر یہ کہتے ہوئے سنا گیا ہے:

"ہماری جیبوں میں بے شمار بااثر افراد رکھے ہوئے ہیں - اگر کسی نے ہمیں چھونے کی کوشش کی تو خود اس کی اُنگلی جل جائے گی"

کونسل کے چودھریوں نے اپنی نااہلی اور کالے کرتوت چھپانے کے لئے چمچوں کا ایک پلٹن تیار کر رکھا ہے جو دن رات اس پروپیگنڈے میں مصروف رہتے ہیں کہ کراچی بلکہ پورا پاکستان ریگستان ہے - ثقافتی سرگرمیوں کے سوتے خشک ہیں - یہاں کے لوگ ذہین نہیں ہیں - آرٹ اور ثقافت کے اعلیٰ نمونے ان کی سمجھ میں نہیں آتے - آرٹس کونسل کے اندھے پیڈتوں اور ان کے چمچوں کو آرٹس کونسل کے علاوہ پاکستان

آرٹس کونسل کے "ریسٹ روم" سے نقاب کون اٹھائے گا؟

بھر میں برائیاں نظر آتی ہیں۔ کاش وہ اپنے ہی گریبان میں منہ ڈال کر دیکھ لیں۔

آرٹس کونسل کے "مہان نیڈتوں" کا فرمان ہے "کہ کراچی میں فنون لطیفہ کی سرگرمیاں پنپ نہیں سکتیں کیونکہ یہ علاقہ خشک اور بنجر ہے"۔ اب کلچر کے ان سورداسوں کو کون سمجھائے کہ یہ علاقہ فنون لطیفہ کا سرچشمہ ہے۔ اس شہر میں ملک کے نامور آرٹسٹ فنکار، ادیب، شاعر اور موسیقار موجود ہیں۔ اس شہر کے کئی فن کاروں نے بیرون ملک اپنے فن کی نمائش اور مظاہرے سے غیر ملکیوں کو مسحور کر لیا۔ اور بین الاقوامی اعزاز حاصل کئے۔

آرٹس کونسل کے ہال اور گیلری کو بیشتر اوقات خالی رکھا جاتا ہے۔ اس کی وجوہ مختلف لوگوں سے مختلف بتائی جاتی ہیں۔ اگر کوئی آرٹسٹ کونسل گیلری میں اپنی تصاویر کی نمائش کی درخواست کرتا ہے تو اسے ٹکا سا جواب دے دیا جاتا ہے "کونسل کا کام محض مصوروں کی تصاویر کی نمائش نہیں رہ گیا ہے اس کا مقصد فنون لطیفہ کے ہر شعبے کی حوصلہ افزائی ہے" جب فنون لطیفہ کے دوسرے شعبے سے تعلق رکھنے والے فنکار اس کے بارے میں سوال کرتے ہیں تو جواب دیا جاتا ہے "کونسل کے قیام کا مقصد مصوروں کی خدمت کرنا ہے"۔

کراچی آرٹس کونسل کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر مسٹر عرفان حسین اکثر فنکاروں سے یہ کہتے سنے گئے ہیں کہ "اگر مقامی فنکار یہ سمجھتے ہیں کہ کونسل انہیں ہاتھوں ہاتھ لے گی اور ان کی خدمت کرے گی تو وہ غلطی پر ہیں۔ کونسل اس لئے قائم کی گئی ہے کہ بیرونی ملکوں سے آنے والے ثقافتی طائفے اور وفود کے لئے جگہ فراہم کی جائے آرٹس کونسل کا بنیادی مقصد باہر والوں سے تعلقات استوار کرنا ہے"۔

ایگزیکٹو ڈائریکٹر اس بات کا بھی اعلانیہ اظہار کرتے ہیں کہ "۶۷ ہزار کی سرکاری گرانٹ انتظامی امور کی دیکھ بھال کے لئے ناکافی ہے۔ اس گرانٹ میں سے ایک پیسہ بھی فنون لطیفہ یا ثقافتی شو کے انتظامات پر صرف نہیں کیا جا سکتا"۔ چنانچہ سرکاری احکامات کی تعمیل میں کونسل کے پنڈت اپنی تمام سرگرمیاں صرف غیر ملکی وفود اور طائفے کے ثقافتی شو ان کے قیام و طعام اور آمد و رفت تک محدود رکھتے ہیں۔

مسٹر عرفان اور کونسل کے دوسرے چودھریوں کا کہنا ہے کہ ان کے پاس اتنا فنڈ نہیں ہے کہ آرٹس کونسل فنکاروں کی سرپرستی کر سکے۔ یہ مسئلہ اپنی جگہ پر درست ہو سکتا ہے، مگر کیا وہ اس سوال کا جواب دیں گے کہ ثقافتی شو اور دوسرے ذرائع سے کونسل کے مالی وسائل میں اضافہ کیوں نہیں کیا جاتا ہے۔؟ کونسل والوں سے اگر آپ یہ سوال پوچھ بیٹھیں تو وہ اس کا ایک ہی جواب دیں گے۔ "کراچی کے عوام جاہل ہیں۔ انہیں فن سے متعلق دلچسپی نہیں"۔ یہ بھی کہیں گے۔ کونسل ایک غیر منافع بخش ادارہ ہے۔ اور منافع حاصل کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے"۔ کونسل والوں نے اس قسم کے جوابات دراصل اپنی سنگین غفلت اور نااہلی پر پردہ ڈالنے کے لئے گڑھ رکھے ہیں۔ وہ ساری ذمہ داری کراچی کے غریب شہریوں کے سر تھوپ کر اپنا دامن جھاڑ لیتے ہیں۔

ایک سال میں صرف ایک تصویر بکی

۶۷-۱۹۶۶ء کے دوران آرٹس کونسل نے پینٹنگ کی ۱۰ نمائشیں منعقد کرائیں ان نمائشوں میں پاکستان کے مشہور اور ممتاز مصوروں نے حصہ لیا ان میں آل پاکستان نمائش بھی شامل ہے جس میں ملک کے تقریباً ۱۲۰ اعلیٰ پائے کے مصوروں کے فن پارے شامل تھے۔ لیکن اس ایک سال کے دوران صرف ایک تصویر ۴۵۰ روپے میں فروخت ہوئی۔ کونسل کو کمیشن کے ۴۵ روپے ملے۔

کونسل کی جانب سے مصور اے بی نذیر مرحوم کی تصاویر کی نمائش کرائی گئی۔ اس نمائش پر کونسل کے ایک ہزار ایک سو ۷ روپے ۱۵ پیسے خرچ ہوئے۔ کراچی میونسپل کارپوریشن کے سابق چیئرمین مسٹر پرویز احمد نے اس نمائش کا افتتاح کیا۔ چیئرمین نے ۴ ہزار روپے کی ایک تصویر خرید لی۔ کونسل والے آج تک فخر یہ اعلان کرتے ہیں۔ "دیکھا ہمارا کارنامہ"۔ حالانکہ کونسل والوں کو اس بات پر شرمندہ ہونا چاہیئے کہ پوری نمائش کے دوران صرف ایک ہی تصویر کیوں فروخت ہوئی۔؟ اگر نمائش میں کونسل والے سیلز میں شپ کا مظاہرہ کرتے تو کئی تصویریں بک جاتیں میونسپل کارپوریشن کے چیئرمین نے فن کار کی بیوی اور بچوں کی خاطر محض عطیہ کے طور پر ایک تصویر خریدی تھی جسے کونسل والے اپنا کارنامہ ظاہر کرنے لگے۔

ایوان قراش اسکینڈل

مارچ ۱۹۶۷ء میں یورپ کے ایک مقبول مصور ایوان قراش کی تصاویر کی نمائش کرائی گئی۔ اس کا انتظام کونسل والوں نے کیا۔ مصور نے نمائش کے دوران فروخت ہونے والی تصویروں میں سے ۳۰ فی صد منافع امریکی سفارت خانے کے ذریعہ مہاجرین کی امداد کے لئے دینے کا اعلان کیا مسز لوئیس سعید نے اپنی سالانہ رپورٹ میں صرف اس بات کی نشاندہی کی جب کہ اس کی تفصیلات کے سلسلے میں ایک لفظ نہیں کہا گیا۔ یہ سوال عوام کے ذہن میں اب بھی موجود ہے کہ نمائش میں کتنی تصویریں فروخت ہوئیں کونسل کو کتنا کمیشن ملا۔ اور سفارت خانے کو کتنا عطیہ دیا گیا۔؟ علاوہ ازیں کونسل والوں نے ایوان کی نمائش پر اپنی جانب سے ۴۸۶۶ روپے خرچ کئے۔ نیز یہ حقیقت بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگی، کہ امریکی سفارت خانے کو آج تک کوئی رقم نہیں دی گئی

شرمناک کارکردگی

۱۹۶۷-۶۸ کے دوران کونسل نے ۸ نمائش کرائیں جن میں بطور کمیشن اسے صرف ایک ہزار ایک سو ۷۰ روپے ملے یہ کمیشن ایک سال میں کل آمدنی کا ۰.۸ فی صد ہے۔ ۱۹۶۸-۶۹ میں کونسل کی جانب سے پینٹنگز کے صرف سات شو ہوئے جس میں ۳ ہزار

باقی صفحہ ۲۵ ملاحظہ فرمائیں



بھی دوسری جنگ عظیم کی پیداوار ہیں

سہگل اور داؤد آدم جی کو پچھاڑ کر آگے نکل گئے

الفتح رپورٹ

پاکستان کی صنعتی دنیا میں داؤد اور سہگل کے بعد تیسرا نمبر آدم جی کا ہے ۔ ۱۹۵۵ء اور ۱۹۶۰ء میں آدم جی کو پاکستان کی نمبر ا پارٹی ہونے کا فخر حاصل تھا۔ لیکن ۱۹۶۵ء میں سہگل نے انہیں پیچھے دھکیل دیا۔ اور ۱۹۶۹ء میں پاکستان کے سب سے بڑے سرمایہ دار خاندان داؤد ان دونوں کو پیچھے پچھاڑ کر پہلے نمبر پہ آگیا۔

آدم جی نے اپنے کاروبار کا آغاز برما میں کیا تھا۔ لیکن دوسری جنگ عظیم سے کچھ دیر پہلے وہ مستقل طور پر کلکتہ میں منتقل ہو گئے۔ برما جیسا چھوٹا ملک ان کے تجارتی پھیلاؤ کے لئے کافی ثابت نہ ہوا۔ دوسری جنگ عظیم نے جب جنوب مشرقی ایشیا اور مشرق بعید کو شعلوں کی لپیٹ میں لے لیا تو آدم جی کا جوٹ کا کاروبار خوب چل نکلا۔

تین بڑے سرمایہ دار خاندانوں (داؤد۔ سہگل۔ آدم جی) میں ایک قدر مشترک نظر آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ ان سب خاندانوں کا بنیادی سرمایہ دوسری جنگ عظیم کے دوران اکٹھا ہوا۔ اور بعد میں مزدوروں اور عوام کے خون پسینے سے یہ تین عظیم سلطنتیں معرض وجود میں آئیں ۔ مزدوروں کا پسینہ آج بھی سونے چاندی میں ڈھل رہا ہے۔ وہ خود زندگی کی بنیادی ضرورت سے بھی محروم ہے۔ اس کی ہڈیوں پر تعمیر ہونے والے محلات میں عیش و عشرت اور ضیاع کا کھیل آج بھی جاری ہے۔

تقسیم کے وقت پاکستان آنے والے سرمایہ دار خاندانوں میں سب سے زیادہ امیر آدم جی تھے ۔ ساتھ ہی ساتھ وہ نسبتاً باضمیر بھی تھے۔ اسی لئے شاید وہ تجارت میں موجودہ زمانے کے جارحانہ اور گھٹیا، اور انسان کش طریقے اتنی تندہی سے نہ اپنا سکے جتنی تندہی سے ان کے دوسرے سرمایہ دار حریفوں نے اپنائے اور اس طرح دولت کی اس دوڑ میں آدم جی آہستہ آہستہ پیچھے رہ گئے۔

کراچی ایکسچینج کی رو سے آدم جی کی مندرجہ ذیل کمپنیاں کام کر رہی ہیں۔

۱۔ مسلم کمرشل بنک لمیٹڈ
۲۔ آدم جی جوٹ لمیٹڈ
۳۔ آدم جی انڈسٹریز لمیٹڈ
۴۔ آدم جی انشورنس کمپنی لمیٹڈ
۵۔ آدم جی شوگر ملز لمیٹڈ

۱۹۶۶ء میں ان پانچ کمپنیوں کا مجموعی اداشدہ سرمایہ ۱۳ کروڑ تھا۔ لیکن اس کے ([illegible]) ۱۶۹ کروڑ سے بھی زیادہ تھے ۔ اور یہ ([illegible]) ان کے ذاتی بنک مسلم کمرشل بنک کے مرہون منت ہے

آدم جی جوٹ ملز، آدم انڈسٹریز اور آدم جی شوگر مل کا انتظام آدم جی سنز کے ہاتھ میں ہے ۔ ۱۹۵۴ء میں ان کمپنیوں کا مجموعی اداشدہ سرمایہ صرف ۸ کروڑ تھا۔ اور ۱۹۶۹ء میں یعنی صرف پندرہ سال میں یہ سرمایہ ۱۵ کروڑ ہو گیا۔

مندرجہ ذیل گوشوارہ ملاحظہ فرمایئے :

سال	اداشدہ سرمایہ (کروڑوں میں)
۱۹۵۵ء	۸
۱۹۶۰ء	۹
۱۹۶۵ء	۱۳
۱۹۶۹ء	۱۵

تقسیم کے وقت پاکستانی سرمایہ داروں میں سب سے امیر آدم جی تھے

اس گوشوارے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۹۶۵ء کے بعد آدم جی کی دولت میں کوئی قابلِ ذکر اضافہ نہیں ہوا۔ اس کی وجہ ان کی محتاط کاروباری پالیسی ہے۔ ۱۹۶۵ء کے بعد کسی قسم کا کوئی پبلک سیکٹر حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ آدم جی جوٹ ملز اور آدم جی انڈسٹریز کی کچھ کمپنیاں بھی ۱۹۶۵ء سے پہلے ہی حاصل کی گئی تھیں۔ ۱۹۶۵ء کے بعد آدم جی کے کاروبار کا پھیلاؤ صرف کمپنیوں کا اداشدہ سرمایہ بڑھانے تک محدود رہا۔ آدم جی نے اپنا سیامانڈ فرٹیلائیزر پراجیکٹ کی سکیم کو ختم کر کے مستقبل قریب میں اپنے کاروباری حریفوں (داؤد اور سہگل) کے مقابلے میں آنے کا چانس بالکل ختم کر لیا ہے۔

۱۹۵۴ء کے بعد آدم جی کے اداشدہ سرمایہ میں سال بہ سال اضافے کی شرح یہ رہی۔

سال	آدم جی انڈسٹریز	مسلم کمرشل بنک	آدم جی جیوٹ	آدم جی انشورنس	آدم جی شوگر	میزان
۱۹۵۴	۲۵۰	۷۵	۵۰۰	-	-	۸۲۵
۱۹۵۵	۲۵۰	۷۵	۵۰۰	-	-	۸۲۵
۱۹۵۶	۲۹۹	۷۵	۵۰۰	-	-	۸۷۴
۱۹۵۷	۳۰۰	۷۵	۵۰۰	-	-	۸۷۵
۱۹۵۸	۳۰۰	۷۵	۵۰۰	-	-	۸۷۵
۱۹۵۹	۳۰۰	۷۵	۵۰۰	-	-	۸۷۵
۱۹۶۰	۳۰۰	۷۵	۵۰۰	-	-	۸۷۵
۱۹۶۱	۳۰۰	۷۵	۵۰۰	۲۵	-	۹.۰۰
۱۹۶۲	۳۰۰	۷۵	۶۰۰	۲۵	-	۱۰.۰۰
۱۹۶۳	۳۰۰	۷۵	۷۰۰	۲۵	-	۱۱.۰۰
۱۹۶۴	۳۰۰	۷۵	۷۰۰	۲۵	۱۵۰	.۵۰
۱۹۶۵	۳۰۰	۱۰۰	۷۰۰	۲۵	۱۵۰	.۷۵
۱۹۶۶	۳۰۰	۱۲۵	۷۰۰	۲۵	۱۵۰	.۰۰
۱۹۶۷	۳۳۰	۱۵۰	۷۰۰	۲۵	۱۵۰	.۵۵
۱۹۶۸	۳۹۶	۱۷۵	۷۰۰	۲۵	۱۶۰	۷.۵۶
۱۹۶۹	۳۹۶	۲۰۰	۷۰۰	۲۵	۱۶۰	۷.۸۱

آدم جی انڈسٹریز لمیٹڈ کاٹن ٹیکسٹائل، پیپر بورڈ اور کیمیکل جیسی انواع اقسام اشیاء تیار کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ جوٹ کی مصنوعات، چینی، بنکنگ اور انش کمپنی جیسی صنعتیں بھی ان کے دائرہ کار میں آتی ہیں۔

آدم جی جوٹ ملز

پاکستان انڈسٹریل ڈویلپمنٹ کارپوریشن کے اشتراک سے قائم ہوئی۔ پاکستا میں آدم جی کی یہ پہلی کمپنی تھی۔ اگست ۱۹۶۲ء میں اے۔ ڈبلیو آدم جی نے اس کمپن کا چارج لے لیا۔ اور اس طرح تمام گودام، بلڈنگ اور مشینری وغیرہ پوری طر آدم جی کی ملکیت میں آگئے۔ اب یہ طے ہوا کہ اس طرح کی تین جوٹ ملیں اور لگائی جائیں گی۔ پہلی مل نے ۱۲ دسمبر ۱۹۵۱ء میں دوسری مل نے ۱۲ دسمبر ۱۹۵۲ء میں اور تیسری مل نے ستمبر ۱۹۵۵ء میں کام کرنا شروع کر دیا۔

جوٹ گڈز کی پیداوار کے لحاظ سے آدم جی پاکستان بھر میں اول نمبر پر ہیں ملک کی ساری پروڈکشن کا تقریباً ساتواں حصہ ان کی ملوں میں بنتا ہے۔ آدم جی اپنی مصنوعات کا ۹/۱۰ حصہ ایکسپورٹ کرتے ہیں۔ اس طرح ایکسپورٹ بونس سکیم کے تحت بے پناہ منافع کمایا گیا اور کمایا جا رہا ہے۔ آدم جی جوٹ مل نے PICIC اور IDBP کے علاوہ بینکنگ ایجنسیوں سے بھی قرضہ حاصل لیا۔

سرمایہ دار ایک دوسرے کی کمپنیوں میں ڈائریکٹر بن رہے ہیں

یہ مل ۱۹۵۲ء میں کراچی سٹاک ایکس چینج کی فہرست پر آئی۔

آدم جی انڈسٹریز

دراصل آدم جی کی اورینٹ ٹیکسٹائل کمپنی، لانڈھی (کراچی) کی جانشین کی حیثیت سے معرض وجود میں آئی۔ اس وقت صرف ایک چھوٹا ٹینٹنگ پلانٹ تجرباتی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ اور باقی سپنڈل کھڈیاں اور دوسری مشینری ابھی لگائی جا رہی تھی۔ اس دوران ۱۶۴۰۰ مزید سپنڈل امپورٹ کئے گئے اس طرح کل تعداد ۶۶۸۰۰ سپنڈل اور ۱۳۲۷ کھڈیاں تک پہنچ گئی۔ اس کے علاوہ ایک عدد باریہ کول بین۔ ریپر اور سپولر اور کرومیم پلیٹنگ پلانٹ انگریونگ سیکشن کے لئے لگائے گئے۔

اکتوبر ۱۹۵۶ء میں پی آئی ڈی سی کے دو پراجیکٹ داماں گر ٹھہائی گریڈ اور بورڈ اور پیپر مل اور نوشہرہ کیمیکل ورکس) بھی حاصل کئے گئے۔ اور آدم جی انڈسٹریز میں ضم کر دیئے گئے۔ اب ان پراجیکٹس کا نام بدل کر آدم جی پیپر بورڈ ملز اور آدم جی کیمیکل ورکس رکھا گیا۔ آدم جی پیپر مل کابل کے کنارے نوشہرہ سے کوئی پانچ میل دور واقع ہے۔ یہ مل سالانہ تقریباً ۷۵۰۰ ٹن کاغذ اور گتہ تیار کرتی ہے۔

آدم جی کیمیکل ورکس میں دس ٹن کاسٹک سوڈا اور ۸٫۵ ٹن کلورین روزانہ تیار ہوتی ہے۔ کاسٹک سوڈا، کاغذ اور گتہ کی صنعت میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے اس طرح آدم جی کیمیکل ورکس کا کاسٹک سوڈا، کاغذ اور گتہ کی مل میں استعمال ہو جاتا ہے۔

آدم جی شوگر مل لمیٹڈ

اس مل کو اس مقصد سے قائم کیا گیا کہ یہ کمپنی نہ صرف خود چینی تیار کرے گی بلکہ چینی بیچنے سے متعلق ہر قسم کا کاروبار بھی اس کے دائرہ کار میں شامل ہوگا۔ یہ مل روزانہ ۱۵۰۰ ٹن گنا استعمال کرتی ہے۔ دریا خان والی فیکٹری نے ۱۶ نومبر ۱۹۶۶ء سے کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس کمپنی نے پی۔ آئی۔ سی۔ آئی۔ سی سے ۲۹٫۶۶٫۳۸۲ ڈالر کا قرضہ حاصل کیا۔ اور یہ قرضہ مجموعی طور پر ادا شدہ سرمایہ کا تقریباً ۹/۱۰ حصہ بنتا ہے۔

مسلم کمرشل بنک لمیٹڈ

یہ بنک ۱۹۴۷ء میں کلکتہ میں قائم کیا گیا۔ لیکن بعد میں اس کا ہیڈ آفس ڈھاکہ منتقل کر دیا گیا۔ اور وہیں کاروبار کی ابتداء ہوئی۔ ۱۹۵۵ء میں ایک بار پھر رجسٹرڈ ہیڈ آفس ڈھاکہ سے اٹھا کر کراچی میں لایا گیا۔ ۱۹۵۱ء تک مسلم کمرشل بنک صرف ۴ برانچوں پر مشتمل تھا۔ ۳۱ دسمبر ۱۹۶۷ء میں یہ تعداد ۲۵۳ تک پہنچ گئی۔ جس میں لندن کی شاخ بھی شامل تھی۔ مسلم کمرشل بنک ملک کے چار بڑے بنکوں میں سے ایک ہے۔ ۱۹۶۶ء میں آدم جی کے ٹوٹل (deposits) ۱۶۹ کروڑ میں سے ۱۲۸ کروڑ مسلم کمرشل بنک کے نام سے تھے۔ اس سال صرف حبیب بنک اور نیشنل بنک کے ڈیپازٹ اس سے زیادہ تھے۔ لیکن بعد ازیں مہگلوں کا یونائیٹڈ بنک ڈیپازٹوں کے معاملے میں اسے کہیں پیچھے چھوڑ گیا۔

آدم جی انشورنس کمپنی

یہ کمپنی ۱۹۶۰ء میں قائم ہوئی اور ۱۹۶۱ء میں کراچی سٹاک ایکس چینج کی فہرست پر آئی۔ یہ کمپنی لائف اور جنرل دونوں قسم کے انشورنس کا کاروبار کر رہی ہے۔ یہ داؤد کی سنٹرل انشورنس کمپنی کے مقابلے میں زیادہ فعال ثابت ہو رہی ہے۔ اب آہستہ آہستہ آدم جی انشورنس کمپنی جنرل سائڈ پر اپنا کاروبار بڑھا رہی ہے۔ اس شعبے میں یہ حبیب گروپ اور قبیسی گروپ کی انشورنس کمپنیوں کے مقابلے میں بہت پیچھے ہے۔

۱۹۶۶ء میں کل ۳۳ ڈائریکٹروں میں سے ۱۵ آدم جی خاندان کے اپنے افراد تھے۔ مندرجہ ذیل فہرست ملاحظہ ہو۔

آدمجی خاندان کے افراد کے نام	ڈائریکٹروں کی تعداد
۱۔ ذکریا آدم جی	۵
۲۔ عبدالواحد آدم جی	۴
۳۔ گل محمد آدم جی	۳
۴۔ محمد حنیف آدم جی	۲
۵۔ عبدالحمید آدم جی	۱
میزان	۱۵

داؤد، حبیب سنز، ولیکا، اصفہانی، وزیر علی اور بھوانی گروپوں کو آدم جی کی کمپنیوں کے بورڈ آف ڈائریکٹرز میں جگہ دی گئی ہے۔ اور آدم جی کو داؤد، حبیب اور حبیب سنز نے اپنے بورڈ آف ڈائریکٹرز میں رکھا ہوا ہے۔ اس طرح آدم جی کا آٹھ دوسرے بڑے سرمایہ داروں سے گہرا تعلق ہے۔ ۱۹۶۰ء اور ۱۹۶۳ء میں زیادہ سے زیادہ منافع تقسیم کیا گیا۔ اور اس کی شرح تقریباً ۱۰ فی صد تھی۔ ۱۹۶۶ء میں یہ اوسط صرف ۳ فی صد تھی۔ ۱۹۵۷ء۔ ۱۹۵۸ء میں منافع ۴ فی صد تھا۔ اور ۱۹۶۵ء میں ۵ فی صد۔

آدم جی پاکستان کے دوسرے سرمایہ دار گروپوں کے سامنے فخر سے سر بلند کر سکتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کا کاروباری اور سماجی مزاج کافی حد تک مختلف ہے۔ اس گروپ کا اپنے ملازمین سے سلوک نسبتاً بہتر ہے۔ آدم جی کئی تعلیمی اداروں اور ادبی سرگرمیوں کی سرپرستی کر رہے ہیں۔ لیکن حال ہی میں ان کے نام سے چلنے والے ایک تعلیمی ادارے (آدم جی کامرس کالج) کا محض چند ہزار روپے خسارے میں ہونے کی وجہ سے بند کر دیا جانا کوئی قابل تعریف فعل نہیں۔ اس سے ان کی علمی اور ادبی خدمات پر حرف آ گیا ہے۔

سرمایہ دار معاشرے کا دوسرا رُخ

برطانیہ کی پولیس اور سکاٹ لینڈ یارڈ ناکام ہو گئے



یہ پانچ ماہ کی دُودھ پیتی بچّی اغواء کرلی گئی ہے

نون الف

"پلیز۔ پلیز۔ پلیز مجھے اتنا تو بتا دو کہ میری بے بی محفوظ ہے"۔

"خدا کے واسطے میری ننھی منی گڑیا کو واپس کردو وہ صرف آسٹر ملک پیتی ہے"۔

یہ ہارلو میں رہنے والی ایک دکھی ماں کی فریاد ہے، جس کی پانچ ماہ کی بچی ڈینائز شیلا کو اغوا کر لیا گیا اغوا کی تاریخ کا سب سے اندوہناک واقعہ ہے مجرموں نے یہ بھی خیال نہ کیا کہ اتنی منی سی گڑیا کو ماں کی چھاتی سے الگ کر کے وہ کتنا بھیانک ظلم کر رہے ہیں۔ شیر خوار بچی کی جدائی میں ماں پر کیا قیامت گزر جائے گی۔ اغوا کی وجہ پیسے کا لالچ بتایا گیا ہے۔ برطانوی طرز معاشرت اور سامراجی تہذیب اس حد تک گمراہ ہو جائے گی، اس کے خیال سے لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔

ہارلو کا رہائشی علاقہ ہے، صاف ستھرا، کشادہ سر سبز مکانات اور دکانیں پختہ اور خوبصورت ہیں یہاں ایک جدید طرز کے مکان میں ۲۵ سالہ ٹیری ویر اور اس کی ۲۴ سالہ حسین بیوی پیٹ رہائش پذیر ہیں دونوں کام کرتے ہیں خوشحال ہیں اور اطمینان کی زندگی گذار رہے ہیں، پانچ ماہ پیشتر پیٹ نے ایک خوبصورت اور تندرست بچی کو جنم دیا، ٹیری نے پہلی بار محسوس کیا کہ اب وہ محض ایک شوہر ہی نہیں ایک بچی کا ذمہ دار باپ بن گیا۔ پیٹ کی ممتا جاگ اٹھی جب وہ اپنی بچی کو دودھ پلاتی تو اس کا سارا جسم ایک نئی لذت سے کپکپا اٹھتا وہ ماں بن چکی ہے ایک ایسی ماں، جس کی گود میں مستقبل کی ایک نئی پیٹ پرورش پانے لگی ہے۔ بچی روتی تو اس کے جسم کا رواں رواں ایک نئے دکھ کے احساس سے بے چین ہو جاتا۔

جمعہ کا دن ہے ویک اینڈ سے پہلے وہ کچھ خریداری کرنا چاہتی ہے۔ گھر کے ضروری کاموں سے فارغ ہونے کے بعد اپنی بچی کا کپڑا تبدیل کرتی ہے۔ اپنا بھی ہلکا سا میک اپ کرتی ہے۔ پھر بچی کو چھوٹی سی گاڑی میں لٹا کر گھر سے باہر نکلتی ہے۔ گھر کا دروازہ بند کرتی ہے اور بچی کی گاڑی آہستہ آہستہ چلاتی ہوئی سڑک پر آجاتی ہے۔ قریب ہی مارکیٹ ہے، جہاں سے وہ سامان خریدنا چاہتی ہے وہ ایک دکان پر رکتی ہے، مگر مطلوبہ چیزیں نہیں ملتیں۔ وہ دوسری دکان کی جانب بڑھ جاتی ہے۔ یہاں اس کی مطلوبہ چیزیں موجود ہیں جب وہ سودے کی قیمت چکا کر بچی کی گاڑی کی طرف پلٹتی ہے تو اس کا سر چکرا جاتا ہے گاڑی خالی ہے اور چھوٹی سی بچی ندارد ہے۔ وہ سمجھتی ہے شاید کسی نے پیار سے بچی کو گود میں اٹھا لیا ہے، بے چینی اور اضطراب کے عالم میں ادھر ادھر دیکھتی ہے، مگر کسی کی گود میں اپنی بچی کو نہیں پاتی ہے۔ وہ پاگلوں کی طرح چیختی چلاتی پوری دکان اور اس کے اطراف میں چکر لگاتی ہے "خدا کیلئے مجھ پر کرم کرو۔ میری بچی واپس کر دو"۔

بچی اس جگہ ہوتی تو واپس ہوتی۔ اس کا تو دور دور تک اتا پتا نہ تھا ظالموں نے بڑی صفائی سے بچی کو اغوا کیا تھا۔ چند لمحوں میں وہاں پولیس پہنچ گئی۔ اس جگہ موجود لوگوں سے پوچھ گچھ کی گئی اگر کسی کے جواب سے اغوا پر روشنی نہ پڑ سکی نہ اغوا کرنے والوں کے متعلق کچھ معلوم ہو سکا۔

نوجوان ماں پیٹ کی حالت بہت خراب تھی اس کے بال بکھر گئے تھے ہونٹ خشک تھے۔ اس کی نگاہیں خلا میں ٹھیک رہی تھیں۔ وہ کسی ایسے فرشتے کے انتظار میں تھی جو آن کر اس کی بچی کا پتا بتا دیتا۔ یا صرف اتنا کہہ کر ایک تڑپتی ہوئی ماں کو تسلی دیتا۔ "اپنے آنسو روک لو۔ تمہاری بچی خیریت سے ہے"

ٹیری کو جب حادثہ کی خبر لگی تو وہ بولا گیا اس نے فوراً اپنے دفتر سے چھٹی لی اور موقعہ واردات پر پہنچ گیا۔ اس کی بیوی کا عجیب عالم تھا بال بکھرے تھے۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جمی تھیں۔ آنکھیں روتے روتے سوج گئی تھیں۔ اس کے ہونٹ بار بار ہلتے اور خفیف سی آواز نکلتی "پلیز۔ پلیز مجھے اتنا تو بتا دو کہ میری بے بی محفوظ ہے۔ وہ صرف آسٹر ملک پیتی ہے"۔

اس کے چاروں طرف تماشائیوں کی بھیڑ لگی تھی۔ پیٹ کے بے قابو جذبات سے ہر شخص متاثر نظر آتا مگر کوئی اس کی بے بی کا پتا نہ بتاتا، ممکن ہے، اس بھیڑ میں اغوا کرنے والا یا اس کے گروہ کا کوئی شقی القلب آدمی بھی موجود ہو، مگر بچی کی جدائی میں آہ و فغان کرنے والی ماں کے آنسوؤں کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا سارے ہونٹ سلے ہوئے تھے۔ اور ہر آنکھ میں لاعلمی کا تکلیف دہ سوالیہ نشان ناچ رہا تھا۔

پولیس نے ٹیری کا بیان لیا۔ اس کا بیان سادہ اور ہر قسم کی پیچیدگی سے پاک تھا۔ اس نے کوئی ایسی بات نہ بتائی جس سے اغوا کرنے والوں پر روشنی پڑتی اس نے اپنے بیان میں یہ بھی کہا کہ "اس کا کوئی دشمن نہیں ہے نہ ہی وہ کسی پر شک کرتا ہے۔ اس کے محلے والے بھی اس جوڑے سے ناخوش نہ تھے۔ کیونکہ وہ دونوں اپنے کام سے کام رکھتے۔ ان کا ساری دلچسپی گھر میں سمٹی ہوئی تھی۔ پولیس نے ٹیری اور موقع پر موجود چند خریداروں سے بیانات لینے کے بعد پیٹ اور ٹیری کو ان کے گھر روانہ کر دیا۔ اور اغوا کی تفتیش شروع کر دی۔ اس سلسلے میں اسکاٹ لینڈ سے بھی تعاون حاصل کیا گیا۔ مگر ابھی تک نوجوان جوڑے کی گمشدہ بچی کا کوئی سراغ نہیں مل سکا۔

پانچ ماہ کی بچی کی جدائی میں تڑپنے والی ماں پیٹ کا حال برا ہے۔ وہ پولیس اور اسکاٹ لینڈ والوں کو جھڑک دیتی ہے کبھی کبھی براہ راست اغوا کرنے والوں کو مخاطب کر کے کہتی ہے "سنو، اگر میری بچی کو کسی ایسی عورت نے اغوا کیا ہے جس کی کوئی اولاد نہیں ہے، اور وہ میری بچی کو اپنی لڑکی بنانا چاہتی ہے تو میں اس سے صرف اتنا کہتی ہوں۔ میری گود اجاڑنے سے تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔ تم میرے کرب کا اندازہ لگاؤ اور میری بچی واپس کر دو۔ میری ممتا کو تڑپا کر تمہیں سکون نہ ملے گا۔ پھر پیٹ اپنے گھر آنے والوں کو مخاطب کر کے چلاتی ہے:" اگر میری بچی کو بلیک میلنگ کی غرض اغوا کیا گیا ہے تو میں انہیں بتا دوں میرے پاس کچھ نہیں میرے پاس ایسی کوئی قیمتی چیزیں نہیں، جو میری بچی کی واپسی کا سبب بن سکے



میں محنت کش عورت ہوں

بچی کی واپسی کے لئے میرے پاس کوئی معاوضہ نہیں ہے

میں محنت کرنے والی ایک عورت ہوں مقامی بنک میں تھوڑی سی رقم جمع ہے اگر چاہوں تو میں تمہیں دے سکتی ہوں"۔

نوجوان پیٹ، اکثر و بیشتر برطانوی پولیس کو برا بھلا کہتی ہے "۔ تم لوگ اصلاح کی جانب توجہ نہیں دیتے، جرائم کی بیخ کنی نہیں کرتے، جرائم کی حوصلہ افزائی کرتے ہو۔ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر ہمارا ملک اغوا، قتل اور گھناونے کاروبار کی دلدل میں کس طرح دھنستا جا رہا ہے، بتاؤ مجھے۔ جواب دو۔ مجھے میری بچی واپس دلاؤ، ورنہ میں معاف نہیں کروں گی"۔

پیٹ جس دکان سے سودا لے رہی تھی، اس کے مالک نے پولیس کو بیان دیتے ہوئے بتایا۔ "پیٹ جب سودا لے رہی تھی، تو ایک نوجوان عورت اس کے اسٹور میں داخل ہوئی، اس کی عمر ۲۵ اور ۳۰ کے درمیان میں ہوگی، اس کا قد لمبا تھا، سڈول جسم اور لمبے سیاہ بال تھے، اس کے چہرے سے گھبراہٹ مترشح تھی میں نے اس بات پر غور نہیں کیا۔ جب وہ واپس گئی تو اس کی گود میں ایک بچی تھی ممکن پہلے اس کے پاس پہلے سے بچی ہو، مگر جب وہ واپس گئی تو اس کی گود میں ایک بچی ضرور تھی۔ چونکہ میں کاؤنٹر کے پاس کھڑا تھا اس لئے اس پر نظر پڑ گئی۔

اغوا کے دوسرے دن پولیس نے کتوں کی مدد سے قریب کے علاقوں اور میدانوں کا کونا کونا چھان مارا غوطہ خوروں نے تالابوں میں اتر کر تلاشی لی۔ پولیس کے گشتی دستے نے پورے شہر میں لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ گمشدہ بچی کی واپسی کی اپیل کی مگر بچی کا کوئی سراغ نہ ملا۔

ایسک سی آئی ڈی کے سربراہ چیف سپرنٹنڈنٹ لن وائٹ بچی کی گمشدگی سے خاصہ پریشان ہے برطانوی پریس میں یہ بات آجانے سے پولیس کی کارکردگی کے ساتھ ملک کا وقار بھی مجروح ہوا ہے۔ حکومت اس مسئلے میں پوری دلچسپی لے رہی ہے اور پولیس پر برابر دباؤ ڈال رہی ہے کہ جلد سے جلد بچی کا پتا چلایا جائے ادھر یہ اغوا کا واقعہ برطانوی پریس سے نکل کر بین الاقوامی پریس میں پہنچ گیا۔ اس سے برطانوی حکومت اور پولیس کی ساکھ کو زیادہ نقصان پہنچا ہے کل تک جس پولیس کی ساکھ کی دھوم ساری دنیا میں مچی تھی آج وہی پولیس ایک معصوم بچی کا سراغ لگانے میں ناکام ثابت ہو رہی ہے چیف سپرنٹنڈنٹ لن وائٹ نے اپنے ہر ذرائع سے گمشدہ بچی کو ڈھونڈ نکالنے کی کوشش کی۔ مگر اسے شدید ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔

باقی صفحہ ۴۴ پر ملاحظہ فرمائیں

الفتح کراچی

جنّت

شمشاد احمد

ایک کڑک دار آواز آئی۔

غفورے کو محسوس ہوا جیسے اس کے کانوں کے پردوں پر ہزاروں برس سے، منوں بھاری ہتھوڑے برس رہے ہیں اس کے دل کے گوشت کا ہر تار اپنی جگہ پر اچھلنے کودنے لگا۔ اور اس کی ہڈیوں نے گوشت دیا ہے۔

وہ جھولتا ہوا زمین پر گر گیا۔

اس نے آنکھوں کے سامنے تنے ہوئے اندھیرے کی دبیز چادر میں سے جھانکنے کی کوشش کی۔ وہاں بے شمار تارے آپس میں ٹکرا رہے تھے آہستہ آہستہ ان تاروں کی رفتار کم ہونے لگی اور ساتھ ہی تعداد بھی۔

غفورے نے اندھیرے کی اس دبیز چادر میں نسبتاً کم تاریکی کے رخنوں میں سے جھانکا

جو فرشتہ اسے ساتھ لایا تھا وہ سربسجود تھا۔

غفورا لڑکھڑاتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے فرشتے کو پکارا۔

"یہ کیا چکر ہے؟"

فرشتہ سہما سہما ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ پھر دبے لفظوں میں بولا۔

"غفورے۔ تمہیں بیس بار بتا چکا ہوں کہ تم بارگاہ رب العزت میں پیش ہونے والے ہو۔ کم از کم بول ہی تمیز سے لیا کرو۔"

غفورے کو بیسویں بار بھی فرشتے کی بات سمجھ میں نہ آئی آخر وہ پوچھ ہی بیٹھا۔

"یار جب سے یہاں لائے ہو ہر وقت بس ڈانٹتے ہی رہتے ہو اور بار بار یہ خوفناک آواز پیدا کرتے جاتے ہو۔ اب میں پڑھا لکھا تھوڑا ہوں کہ ہر وقت خوبصورت لفظ بنا بنا کر بات کروں!" فرشتہ حیرانی سے اسے تکے جا رہا تھا۔

"اچھا یہ بتا یہ جو بڑی لفرے دار آواز آتی ہے یہ تیری ہی شرارت ہے نا؟"

فرشتے نے ہونٹ بھینچ لئے اور اتنی سختی سے کہ اس کے ہونٹوں سے لال لال خون کے قطرے موتیوں کی صورت میں زمین پر گرنے لگے۔

غفورا لمحہ بھر ان موتیوں کو زمین پر گرتے دیکھتا رہا پھر لپک کر انہیں اکٹھا کرنے لگا۔ جب وہ یہ موتی جیب میں ڈالنے لگا تو فرشتہ سے نہ رہا گیا وہ چیخ اٹھا

"باہر نکال ان موتیوں کو۔ تو یہاں بھی چوری سے باز نہیں آتا۔"

غفورا سارے موتی جیب میں ڈال کر اطمینان سے اٹھا اور فرشتے کے قریب آ گیا۔

"دیکھو یار۔ موتی دیکھ کر صبر نہیں ہوا۔ ورنہ میں نے ساری زندگی بس دو ایک بار ہی چوری کی ہے۔ اس سے زیادہ نہیں۔"

غفورے نے بڑھ کر فرشتے کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اسے محسوس ہوا کہ اس کا ہاتھ یخ کے سمندر میں جا پڑا ہے اس نے فوراً کھینچ لیا۔

"تم بہت ٹھنڈے ہو۔ دیکھو نا۔ یہ موتی یہاں بیکار پڑے رہیں گے۔ ضائع ہو جائیں گے سچ کہہ رہا ہوں میرے کام آ جائیں گے۔ تیرا کیا جائے گا۔ جب منے کی اماں انگوٹھی پہن کر گلی میں نکلے گی تو سارا محلہ دیکھتا رہ جائے گا۔" فرشتہ پریشان ہو گیا۔ اتنا پریشان کہ اس کے سر کے بال بھاپ بن کر فضا میں تحلیل ہو گئے۔

یہ دیکھ کر غفورے پر ہنسی کا دورہ پڑا۔ اس نے ہنستے ہنستے فرشتے کی شفاف چندھیا پر ایک ہاتھ بھی جڑ دیا۔ پھر اپنے ٹھنڈے ہاتھ کو دوسرے ہاتھ سے مل مل کر گرم کرنے لگا۔

آسمان پر زلزلہ آیا ہوا تھا۔

ایسا گنوار، بدتمیز اور جاہل مردہ آج تک نہ آیا تھا جو فرشتوں سے بھی ہنسی ٹھٹھول سے باز نہ آتا ہو اس کی بدتمیزی کی اطلاع خدائے لم یزل کو پہنچا دی گئی تھی۔ وہاں سے حکم ملا تھا کہ اسے ابھی فوری طور پر بارگاہِ رب العزت میں پیش نہ کیا جائے فرشتے بھی سمجھ گئے تھے کہ یہ گستاخ کہیں وہاں بھی گستاخی نہ کر بیٹھے اور یہ فرشتہ چوبیس گھنٹے غفورے کے ساتھ لگا رہتا۔ اس نے ہزاروں طریقے آزمائے پر غفورے پر کوئی اثر نہ ہوا الٹا فرشتہ پریشان تھا غفورے کی حرکات اس نے پہلی بار دیکھی تھی۔ وہ پہلی بار نئے احساسات سے روشناس ہوا تھا۔ جنہیں وہ پہچان بھی نہ پا رہا تھا۔ کئی بار اس کے جی میں آیا خدائے لم یزل کے حضور عرض کر دے کہ یہ مردہ سمجھنے کا نہیں۔ اس نے مجھے لاچار کر دیا ہے۔ وہ اس کمین کو خود ہاتھ میں لے لے۔ لیکن غلامی اس کی سرشت میں داخل تھی۔ وہ کچھ بھی نہ کہہ پایا فرشتے نے نظریں اٹھائیں تو اسے عجیب و غریب منظر نظر آیا۔ غفورا مزے سے ایک بڑا پتھر ہاتھ میں لئے دوسرے پتھر کو توڑ رہا تھا۔ فرشتہ سے نہ رہا گیا۔

"غفورے۔ یہ کیا کر رہے ہو۔؟"

غفورے نے فرشتے کو گھور کر دیکھا۔

"ہاتھ میں کھُجل ہو رہی تھی۔ سوچا چلو پتھر ہی توڑیں کچھ تو کرنا چاہئے تم مجھے بیکار لئے پھر رہے ہو بڑے بوڑھوں نے کہا ہے بیکار دماغ شیطان کا گھر ہوتا ہے۔ لے یہ لے تو بھی توڑ۔"

غفورے نے فرشتہ کے ہاتھ میں پتھر تھما دیا فرشتے نے بغیر سوچے سمجھے پتھر لیا اور اسے ایک دوسرے پتھر پر دے مارا

فرشتہ لرزنے لگا۔ اس کے روئیں روئیں میں ایک عجیب سی کیفیت سرائیت کر گئی۔ اسے اپنا آپ ہلکا پھلکا محسوس ہونے لگا۔ پھر وہ بے خودی میں پاگلوں کی طرح پتھر توڑنے لگا۔

غفورا ہنسنے لگا۔ پھر وہ فرشتے کے قریب آ گیا

"ذرا سنبھل کر دوست۔ کہیں پاؤں پر نہ مار لینا۔"

فرشتہ رک گیا اور بکھرے ہوئے پتھروں کو عجیب عجیب نظروں سے دیکھنے لگا۔ غفورے نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

"تبا مزہ آیا نا۔؟ یہ تو کچھ نہیں۔ چل میرے ساتھ میری دوکان پر۔ میں کمہار ہوں برتن بناتا ہوں برتن بنانے کا تو مزہ ہی اور ہے۔ چل اب کچھ کھانے کا بھی بندوبست کر۔"

عفورے نے کہنے کو کہہ دیا کہ کھانے کا بندوبست کر لیکن وہ سوچنے لگا اسے تو بھوک ہی نہیں ہے۔

فرشتہ ایک بار پھر پریشان ہو گیا۔ اتنا پریشان کہ اس کا دماغ کھوپڑی سے نکل کر ہوا میں معلق ہو گیا عفورے کے قہقہوں سے فضا میں گستاخی پھیلنے لگی پھر وہی کڑک دار آواز آئی جس سے عفورے کی جان نکل جاتی تھی۔ وہ بے ہوش ہو گیا۔ جب اس کی آنکھیں کھلیں تو اس نے اپنے ارد گرد عجیب دلفریب نظارہ پایا۔ ہر طرف نور کی بارش ہو رہی تھی۔ خوش الحان پرندے نغمے گا رہے تھے۔

عفورا کپڑے جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے پاؤں کے پاس ہی دودھ کی نہر بہہ رہی تھی۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ اس نے نہر میں چھلانگ لگا دی۔ تازہ تازہ شیریں نیم گرم دودھ اس کے معدے میں اترنے لگا عفورا شاید پوری نہر ہی پی جاتا لیکن فرشتے نے اسے روک دیا

"یہ نہر ازل سے بہہ رہی ہے اور ابد تک بہتی رہے گی۔ تم جب چاہو پی سکتے ہو۔ یہ تمہارے ہی لئے ہے"

عفورے نے شکوک نظروں سے فرشتے کو گھورا "دیکھو مجھ سے دھوکہ نہیں کرنا۔ میں خود بہت بڑا دھوکہ باز ہوں"

عفورا تذبذب کے عالم میں کھڑا تھا کہ فرشتہ بولا۔

"مبارک ہو عفورے۔ رب العزت کے کرم سے تمہیں جنت میں جگہ مل گئی ہے۔" عفورے کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

"میں جنت ہے؟ یہ دودھ کی نہریں۔ میں تو بڑا گناہگار آدمی ہوں۔" فرشتے نے کوئی جواب نہ دیا عفورے نے اشتیاق سے ادھر ادھر دیکھا تو اس کی نظریں ایک ادھ کھائے سیب پر جا پڑیں عفورا اس سیب کی طرف لپکا۔ اسے اٹھانے ہی والا تھا کہ فرشتہ بیچ میں آ کھڑا ہوا۔

عفورے نے کھا جانے والی نظروں سے فرشتہ کو گھورا۔

"دیکھتا نہیں کتنا لال لال سیب ہے۔ باقی آدھا تو کھا گیا ہوگا؟

فرشتہ تذبذب میں مبتلا تھا۔

"یہ سیب آدم نے کھایا تھا۔"

عفورا پھٹ پڑا۔

"آدم نے کھایا تھا مجھے تمیز سکھا رہا ہے خود آدم کہتا ہے حضرت آدم علیہ السلام کہو۔ پیغمبر تھے جانتے ہو۔؟"

عفورے نے ابھی جملہ ختم بھی نہ کیا تھا کہ اسے پاس ہی قہقہوں کی آواز سنائی دی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو حوروں کا ایک جم غفیر اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔

عفورے نے یا علی کا نعرہ بلند کیا اور پاگلوں کی طرح حوروں کی جانب دوڑ پڑا۔ حوریں سمٹ کر ایک طرف ہٹ گئیں عفورے نے پھر بھی ایک حور کو کمر سے دبوچ لیا۔

"حور بھی۔ ڈریں نہیں۔ میں عفورا ہوں دنیا سے آیا ہوں مجھے اللہ تعالے نے جنت میں بھیجا ہے"

فرشتے نے انگلی اٹھائی۔ عفورے کا ہاتھ جل اٹھا۔ اس نے جلدی سے حور کو چھوڑ دیا اور ایک طرف ہو کر ہاتھ دبانے لگا۔

فرشتہ اسے دیکھ کر مسکرانے لگا۔ عفورے نے غصے سے منہ دوسری طرف پھیر لیا اور منہ پھیرتے ہی اس کی نظر پھلوں سے جھکے ہوئے درختوں پر پڑی وہ چھلانگیں لگاتا ہوا ایک درخت پر چڑھ گیا اور بے تحاشہ پھل توڑنے لگا۔

عفورے نے جنت میں ایک اودھم مچا رکھا تھا۔ یہاں کا ہر باسی حیران تھا کہ خدائے لم یزل نے ایسے عجیب و غریب کھلنڈرے مردے کو یہاں کیسے بھیج دیا ہے یہ تو جنت کی سنجیدگی کی روح کو زخمی کر رہا ہے لیکن وہ سب اسے خدائے برتر و اعلیٰ کی کوئی مصلحت سمجھ کر اپنے دل کو تسکین دے لیتے۔

عفورے کی ان عجیب و غریب حرکات کا سلسلہ چلتا رہا جنت کے مکین آہستہ آہستہ اس کے شور و غل کے عادی ہونے لگے۔ لیکن تھوڑے عرصہ بعد فرشتوں نے اور دوسرے جنتیوں نے محسوس کیا کہ عفورے میں تبدیلی رونما ہونے [illegible] اس کی شوخی آہستہ آہستہ سنجیدگی میں بدلنے لگی ہے۔ پہلے وہ دم بھر نچلا نہ بیٹھتا تھا۔ اب گھنٹوں گم صم بیٹھا رہتا ہے۔ حوروں کی طرف نظر اٹھا کر نہ دیکھتا دودھ کی نہریں اس کی توجہ کی محتاج رہتی ہیں۔ اور درختوں کے پھل ٹوٹ ٹوٹ کر اس کی جھولی میں گرتے ہیں اور وہ نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔

فرشتے خوش تھے کہ ان کی محنت رنگ لائی ہے اور یہ گنوار اور بدتمیز مردہ آخر کار راہ راست پر آ ہی گیا ہے اچانک ایک دن پھر ایسی بات ہوئی کہ فرشتے سپٹا گئے

ایک طرف سے ایک عجیب سی آواز آ رہی تھی۔ جیسے کوئی دھاڑیں مار مار کر رو رہا ہو۔ جنت اور رونا دھونا پھر فرشتوں نے دیکھا کہ ایک درخت کے نیچے بیٹھا عفورا زار و قطار رو رہا ہے جنت کے مردے تو ایک طرف دوزخ کے مردے بھی دیواروں پر چڑھ چڑھ کر یہ منظر دیکھنے لگے۔ جنت کی خاموش پرسکون فضا میں پہلی بار ایسا شور و غل سنا گیا تھا۔

فرشتوں نے ہزار کوشش کی کہ عفورا چپ ہو جائے پھلوں کے درخت چلتے ہوئے آئے اور جھک گئے کہ عفورا پھل توڑ سکے۔ نہریں اس کے قدموں کو چھو کر گذریں کہ وہ انہیں ایک نظر دیکھ لے حوریں دائرے کی صورت میں عفورے کے ارد گرد جمع ہو گئیں لیکن عفورے کی چیخیں نہ رکیں۔ وہ مسلسل آہ و بکا کرتا رہا۔

جب فرشتے بے بس ہو گئے اور جنت کے باسیوں کے کان پھٹنے لگے تو وہی کڑک دار آواز آئی۔ عفورے کے بہتے ہوئے آنسو تھم گئے اس کی چیخیں یک لخت بند ہو گئیں۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ ابھر آئی اس لئے کہ یہ احساس اس کے رگ و پے میں سرایت کر گیا کہ خدائے لم یزل خود اس کے سامنے موجود ہے۔ وہ خود اس کی فریاد سننے آیا ہے۔

عفورے کا سرکش سر خود ہی خود جھک گیا۔ وہ دوسرے فرشتوں کی طرح، جنت کے مکینوں کی طرح سربسجود ہو گیا۔ پھر اس کے گلے سے اٹک اٹک کر آواز نکلی۔

"رب العزت۔ تو سب کا ہے۔ اس لئے عفورے کا بھی ہے میری عرض ہے سن لے۔ مجھے واپس دنیا میں بھیج دے یہاں تیری جنت میں میرا دم گھٹنے لگا ہے۔"

ایک اور دھماکہ ہوا۔ فرشتوں کے سرا

ں میں دھنس گئے۔ درخت اور ٹیڑھے ہو گئے
ورے کو محسوس ہوا جیسے کون و مکاں میں
ت پر شفقت مسکراہٹ ابھری ہے اور اس
کراہٹ نے ہر شے کو اپنے اندر لپیٹ لیا ہے۔
ب سے آواز آئی
"غفورے اٹھ"۔ غفورا اٹھ گیا۔
اسے محسوس ہوا جیسے کوئی چلا رہا ہے۔ پھر یہ
ور سے آتی ہوئی آواز قریب آگئی۔ اس کی بیوی
سنے دے رہی تھی۔
"سورج سر پہ آگیا ہے۔ ابھی تک پڑے ہوئے
و۔ آج کام پر نہیں جاؤ گے۔ تمہیں کیا بھوکے
ریں گے میں اور میرے بچے۔ تمہیں تو بس نیند
یاری ہے۔"
غفورے نے چھلانگ لگائی اور بستر سے باہر آگرا
پھر اس نے حیرانی سے اپنے ارد گرد کا جائزہ لیا

وہی مٹی سے لپی ہوئی کٹیا۔ کونے میں جلتی ہوئی
آگ اور اس پر رکھی ہوئی گندی، سیاہ دیگچی اور
چولہے کے پاس بیٹھی ہوئی اس کی بیوی جو حیرانی
سے اسے دیکھ رہی تھی۔ "فاطمہ۔ ٹھیک تو ہو؟"
نہ جانے غفورے نے کیسے پوچھ لیا۔
"ہاں ہاں ٹھیک ہوں۔ اب تم کام پر بھی جاؤ گے
یا نہیں۔" غفورے کے چہرے پر ایک بھرپور مسکراہٹ
ابھری۔ اور مٹی سے لپی ہوئی کٹیا میں نور کی بارش
ہونے لگی۔ ہر طرف سے خوش الحان پرندوں کے
نغموں کی آواز ابھرنے لگی۔ اور گڑ والی چائے پیتے
ہوئے غفورے کو بچوں کا خیال آیا۔
"فاطمہ۔ بچے کہاں ہیں؟"
فاطمہ حیران سی اٹھ کر غفورے کے پاس
آگئی۔ پھر اس کا ہاتھ چھو کر دیکھا اور بولی۔ "تم خیریت
سے تو ہو؟" اور غفورا ہنس دیا
ہنستے ہنستے اس نے فاطمہ کے ہاتھ سے دوپہر
کے کھانے کی پوٹلی لے لی۔ اور باہر کی طرف لپکا۔
دروازے پر اس کے تین ننگ دھڑنگ، کیچڑ میں
لت پت بچے کھیل رہے تھے۔
غفورے نے حسب معمول گندی گالیاں دینے
کی بجائے ایک ایک کو اٹھایا۔ سینے سے بھینچ کر
پیار کیا اور پھر ایک نئی مسکراہٹ کا دامن تھامے
کام پر چل دیا۔

حسین رفیق

اندھی نگری

یہ دُنیا ایک اندھی نگری
اس دنیا میں بسنے والے
اندھے گونگے بہرے لوگ
کس کو دکھاؤں میں
زخمی دل
کس سے پوچھوں
اپنی منزل
کون سُنے گا
میرا حال
میرا دل کس غم سے گھائل
تیرے غم سے
اُس کے غم سے
سب کے غم سے
اس دُنیا میں بسنے والے
دُکھ کے مارے اِنسانوں کے
غم کی دُنیا
میرا دل
میری منزل

حق کی اور انصاف کی بستی
امن کا شہر
پیار کی لہر
جس میں کوئی گھول نہ پائے
دُکھ کا زہر
میرا حال
جنگ کے شعلے ناچ رہے ہیں
چاروں اور
دُکھ کے بادل
ظلم کی آندھی
خُون کی بارش
صدیوں کی تاریخ ہے شاہد
کوئی تو دیکھے
کوئی تو بولے
کوئی تو سُن لے چیخ رہا ہے
صدیوں سے بے کس انسان
کاش کوئی امرت رس گھولے
خالی کر کے زہر کے پیالے

ٹیلیویژن کی اہم شخصیتوں سے ملیئے

رازداں

ناظرین کرام!

"پاکستان میں ٹیلی ویژن وقت سے پہلے آگیا"

"ہمارا غریب، پس ماندہ ملک ابھی عیاشی کا متحمل نہیں تھا۔"

"ٹیکس دہندگان کا سرمایہ ایک مخصوص طبقہ کی پرورش پر ضائع ہو رہا ہے۔"

آپ نے اس قسم کی نکتہ چینی ضرور سنی ہوگی لیکن اب وقت آگیا ہے کہ ہم یہ تسلیم کرلیں کہ ٹیلی ویژن ہمارے ملک میں آچکا ہے اور اس پر محنت سے کمایا ہوا زرمبادلہ ضائع ہوا ہے وہ ہو چکا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ٹیلی ویژن کب ایک ایسا ادارہ بنتا ہے جو قومی امنگوں، پاکستانی تہذیب و ثقافت اور صاف ستھری تفریح کا علمبردار ہو۔

آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ پچھلے تین سال.. میں بجائے ترقی کرنے کے کراچی ٹیلی ویژن بالخصوص اور لاہور اور راولپنڈی اسلام آباد ٹیلی ویژن بالعموم تنزل کی طرف گامزن ہے۔ اخبارات اور جریدوں میں پروگراموں پر تبصرہ بھی ضرور آپ کی نظروں سے گزرا ہوگا۔ گھٹیا چربے ڈراموں کے نام سے ٹیلی کاسٹ ہوتے ہیں۔ سفلی جذبات کو ابھارنے والے رقص کے پروگرام آپ کو اپنے خاندان کے افراد کے ساتھ بیٹھ کر دیکھنے پڑتے ہیں۔ "اسلام" پر جو پروگرام ہوتے ہیں انہیں سن کر اور دیکھ کر احساس ہوتا ہے جیسے ہم سب طفلِ مکتب ہیں۔ آخر یہ سب کیوں ہے۔ ٹی، وی کے پس پردہ کیا ہوتا ہے؟ کام اور محنت کی بجائے کارکردگان ٹی وی کی کونسی مصروفیات ہیں جو انہیں پروگراموں پر توجہ نہیں دینے دیتیں۔

تو ناظرین! میں انہی سوالوں کا جواب دینا چاہتا ہوں۔ اور یہ جواب اس طرح سے دوں گا کہ پہلے آپ کو ٹی وی کے سب ملازمین سے فرداً فرداً ملوایا جائے گا۔

کراچی ٹی وی کے سربراہ یعنی جنرل منیجر جناب اسلم اظہر صاحب ہیں۔

مفصل تعارف سے پہلے ایک واقعہ سن لیجئے:

بی بی سی سے ایک پروگرام ڈیوڈ فراسٹ رپورٹ ٹیلی کاسٹ ہوتا تھا جو آپ نے بھی اپنے ٹی وی پر دیکھا ہوگا۔ یہ پروگرام خریدا گیا اور جناب اسلم اظہر نے ٹی وی کے مخصوص لکھنے والوں کی کھیپ کو چائے کی دعوت پر مدعو کیا۔ پھر وی آئی پی ہال میں ڈیوڈ فراسٹ رپورٹ کی ایک فلم دکھائی گئی۔ اور ان سے کہا گیا کہ آپ لوگ اس پروگرام کی نقل لکھ کر لائیں۔

ایک چٹکلے کی قیمت ۵/- روپے قرار پائی اور سکرپٹ لکھنے کے لئے ایک جاسوسی ڈراموں کے چربے اپنے دوستوں کی وساطت سے ریڈیو اور ٹی وی پر پیش کروانے والے نوآموز "رائٹر" کی خدمات حاصل کی گئیں۔ اور ہر ہفتہ کا مشاہرہ قرار پایا مبلغ ۳۰۰/- روپے۔ پھر اسلم صاحب نے اپنے بڑے دنوں کے ایک دوست جن کی صورت و شکل اور ڈھیل ڈھال کم از کم ٹی وی کی سکرین کے لئے بالکل موزوں نہیں ہے کو پنڈی سے کراچی بلوایا اور اس کا بھی ہفتہ وار مشاہرہ مقرر ہوگیا۔

اب لکھنے والے ہر جمعرات کو وی آئی پی ہال میں جمع ہوتے تھے اور اپنے اپنے چٹکلے لکھ کر لاتے تھے۔ اور اسلم صاحب کو سناتے تھے۔ ایک خاتون جن پر اسلم صاحب کا قیمتی وقت ضائع کرنے پر بالکل کوئی پابندی نہ تھی۔ (وہ جب چاہتی تھیں اسلم صاحب کے کمرے میں پی اے کو لفٹ دیئے بغیر جا سکتی تھیں) انگریزی میں چٹکلے لکھ کر لاتی تھیں یعنی وہ اردو سے بالکل نابلد تھیں۔ ان کا ترجمہ ٹی وی کے ایک اور خاکسار راضی وقت کر دیتے تھے اور اسلم صاحب کے قہقہے ان کے چٹکلوں پر بہت ہی جاندار ہوتے تھے۔

ایک دن شامتِ اعمال ایک دیوانہ اٹھ کھڑا ہوا اور کہہ بیٹھا۔

"اسلم صاحب یہ چٹکلے تو پرانے ریڈرز ڈائجسٹ سے چرائے گئے ہیں۔"

اسلم صاحب کے چہرے پر ایک خالص انگریزی مسکراہٹ ابھری۔ جس میں وہ ہر خفت چھپا لیتے ہیں اور پھر پائپ سے میز بجا کر گویا ہوئے

"بھئی یہ کوئی بات نہیں۔ میں تو خود ایک بہت ہی موٹی سی کتاب کا نام لے کر) سے نقل کرکے سکرپٹ لکھواتا ہوں۔"

پرانے ریڈرز ڈائجسٹ سے چرائے گئے چٹکلوں پر مبنی پروگرام

مزید پروگرام دے کر جنرل منیجر نے موسیقار کی عزتِ نفس خرید لی

تو ناظرین یہ تھا ٹی وی کے جنرل منیجر کا جواب اور وہ بھی تقریباً ۲۰ افراد کی موجودگی میں - اب ذرا غور فرمائیے!

اصل کی نقل بن رہی ہے

مواد مختلف انگریزی رسالوں سے چرایا جا رہا ہے -

سکرپٹ خود جنرل منیجر صاحب نقل کروا کے لکھوا رہے ہیں -

اور اصلی پروگرام ٹیلی ویژن کی جیب میں پڑا ہے اور جب نقل دکھائی جا چکی تو اصل کی باری آئی -

کئی معصوم ناظرین تو خوش ہوئے کہ دیکھو بی بی سی بھی اب ہماری نقل کرنے لگا ہے -

تو ناظرین یہ کراچی ٹی وی کے جنرل منیجر صاحب کا تعارف نہیں بلکہ ایک واقعہ ہے - لیجئے اب ان سے ملئے: موزوں قد، گورا رنگ، چہرے پر دبیز شیشوں کا چشمہ، گردن پر صحرا میں اُگی جھاڑیوں کی طرح اُلجھے اُلجھے بال - چہرے پر ایک خالص انگریزی مسکراہٹ جس کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے - ہونٹوں میں دبا ہوا پائپ اور جسم پر فیشن کے مطابق سلے ہوئے بہترین کپڑے - یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ڈکنس کا کوئی کردار ناول سے نکل کر سیٹ پر آبیٹھا ہے -

ناظرین یہ تو تھا حلیہ - حلیہ یقیناً شخصیت کا ایک اہم حصہ ہوتا ہے - لیکن شخصیت کے بنانے میں دوسرے بہت سے عوامل بھی شامل ہوتے ہیں - مثلاً کردار وغیرہ سنا تھا اور بعد میں تصدیق بھی ہوئی کہ ٹیلی ویژن جیسے عوامی ادارے کے سربراہ جنوری کی پہلی تاریخ کو ایک شاندار ضیافت کا اہتمام کرتے ہیں - اس ضیافت میں نہ صرف ہم خیال اور ہم وضع لوگوں کو مدعو کیا جاتا ہے بلکہ ٹی وی کے غریب پروڈیوسروں کو بھی زیر بار احسان کیا جاتا ہے - رقص و موسیقی تو خیر ضروری ہے ہی اور بھی بہت سے لوازمات ہوتے ہیں - ہر مہمان اپنی شراب ساتھ لے کر آتا ہے -

ایک پروڈیوسر جنہیں اپنی کم تنخواہ کی وجہ سے کبھی بوتل کی توفیق نہ ہوئی تھی، کچھ شرمندہ شرمندہ گھوم رہے تھے - انہیں پہلے اشاروں کنایوں میں دعوت دی گئی پھر صاف صاف آفر دی گئی - لیکن برسوں کی جھجک پھر بھی آڑے آرہی تھی - بے چارے نے شرما کر ساقی گری شروع کر دی - یہ تین سال پہلے کا واقعہ ہے امید ہے کہ انہوں نے اب تک اپنی سعادت مندی کا ثبوت ضرور فراہم کر دیا ہوگا -

پھر ایک اور واقعہ بھی آپ کی نظر سے گزرا ہوگا، آپ نے اخبار میں بھی پڑھا ہوگا -

ایک موسیقی کا فن کار جس کا ملک میں ایک خاص مقام ہے، پروگرام پیش کر رہا تھا - اسلم صاحب گھر پر بیٹھے اس پروگرام کو تنقیدی نظروں سے دیکھ رہے تھے - ایک دم سے جوش میں آئے اور اپنی کار سڑک پر بے محابہ چھوڑ دی - پروگرام ختم ہو چکا تھا فنکار جانے کی تیاری میں تھا کہ بیٹ پر جنرل منیجر صاحب نے غلیظ اور فحش گالیوں سے اس کی کسی فنی غلطی پر تنقید فرمائی - جب ہوش و حواس میں آئے تو فوراً معافی مانگ کر اور کچھ مزید پروگرام دے کر فن کار کی عظمت اور غیرت نفس خرید لی -

کون پوچھتا کہ جناب جنرل منیجر صاحب آپ کب سے اور کہاں سے موسیقی کو اتنا سمجھنے لگے ہیں کہ آپ کو ایک منجھے ہوئے فنکار میں نقص نظر آگیا - لیکن سنا ہے کہ شراب ذہن کو جلا بخشتی ہے - تصور کی آنکھ کو بینائی عطا کرتی ہے - شاید ایسا ہی ہوا ہو -

آج کل آپ ایک پروگرام "رات کی آنکھیں" دیکھ رہے ہوں گے - نہیں دیکھ رہے ہوں گے تو کم از کم پہلی دو ایک قسطیں نئے پروگرام کے شوق میں ضرور دیکھ چکے ہوں گے -

ایک دیسی لکھنے والے نے ایک انگریزی ناول لکھا - لکھنے والے صاحب خود پبلشر ہیں لیکن جرأت نہ ہوئی کہ وہ اپنا یہ "عظیم شاہکار" شائع کریں - اسلم صاحب کو پڑھا دیا گیا - کچھ انگریزی زبان کی تحریر کچھ پرانی دوستی - فوراً خرید لیا گیا - کنور آفتاب اور عشرت انصاری جیسے ذہین پروڈیوسروں کو اسے پیش کرنے کے لئے سونپا گیا - کراچی کے منجھے ہوئے اداکار اکٹھے کئے گئے - لیکن جب ناول میں کچھ موجود ہی نہ ہو تو کیا کیا جائے - یہ سب لوگ اسلم صاحب کے غلط انتخاب کی بھینٹ چڑھ رہے ہیں -

کتنا سرمایہ ضائع ہوا؟

کتنی محنت رائیگاں جا رہی ہے؟

کیا اب بھی اسے بند نہیں کیا جا سکتا؟

بالکل نہیں - یہ عزت نفس کا مسئلہ ہے صاحبو - یہ پروگرام آپ کو اس سہ ماہی کے اختتام تک دیکھنا ہوگا - اس لئے کہ یہ جنرل منیجر صاحب کا انتخاب ہے -

(اگلے شمارے میں پروگرام منیجر جناب زمان علی خان)

مستقل خریداروں اور کرم فرماؤں سے

ہمیں اپنے مستقل خریداروں اور کرم فرماؤں کی طرف سے زبانی اور تحریری شکایتیں موصول ہو رہی ہیں کہ انھیں پرچہ باقاعدہ نہیں مل رہا ہے - ہمیں انتہائی افسوس ہے اور ندامت بھی - ہمارے دفتر سے پرچہ باقاعدہ ارسال کیا جا رہا ہے - نہ جانے اس کے مکتوب الیہ تک پہنچنے میں کوتاہی کیوں ہو رہی ہے - ہم اس سلسلے میں پوسٹ ماسٹر جنرل سے باقاعدہ تحریری شکایت کر رہے ہیں - اپنے مستقل خریداروں اور کرم فرماؤں سے بھی گزارش کرتے ہیں کہ وہ اپنے علاقوں کے پوسٹ ماسٹر حضرات سے شکایت کریں - امید ہے کہ آئندہ ہفتے سے اس سلسلے میں کوئی تکلیف نہیں ہوگی ـــــ (ادارہ)

آرٹس کونسل پر بنیادی جمہوریت کے ۳۶۱ ارکان کا قبضہ ہے

صفحہ ۱۴ سے آگے

۳سو روپے کی تصویریں بکیں کونسل کو بطور کمیشن صرف ۳سو۰ ۳روپے ملے۔ کونسل کی یہ کارکردگی افسوسناک ہی نہیں انتہائی شرمناک ہے ۷۰-۱۹۶۹ میں کونسل کو نمائش کے دوران فروخت ہونے والی تصویروں سے کمیشن کے ۲ ہزار ۹ سو ۸۰ روپے حاصل ہوئے کونسل کی تاریخ میں یہ سب سے زیادہ کمیشن ہے۔ لیکن یہ کمیشن کل سالانہ آمدنی کا ۳۰.۲ فی صد ہے۔ کونسل کی کارکردگی اس حد تک گر چکی ہے کہ وہ کمیشن کی وصولی سے اپنے اخراجات تک پورے نہیں کر سکتی

ہماری اطلاعات کے مطابق ۱۹۶۲ اور ۱۹۶۵ء کے درمیانی سالوں میں تصویروں کی فروخت سے کونسل کو زیادہ کمیشن ملا۔ اس کی بڑی وجہ پروگرام افسر کی بھاگ دوڑ، دلچسپی اور جانفشانی تھی۔ یہ اس کی ذاتی جدوجہد تھی جس کا خوشگوار نتیجہ برآمد ہوا اس مثال سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔ کہ اگر کونسل والے سیلز مین شپ کی جانب تھوڑی سی توجہ کریں تو گیلری میں ہی کئی تصویریں فروخت ہو سکتی ہیں ایک آزمودہ کار اور مستعد سیلز مین نمائش کے دوران اپنی ذاتی کوششوں سے کئی تصویر فروخت کروا سکتا ہے۔ مگر اس جانب کونسل والے کبھی توجہ نہیں دیتے۔ فن سے دلچسپی رکھنے والوں نے اکثر ان سے مطالبہ کیا کہ وہ فن کاروں پر رحم کریں، ایک ادھ سیلز مینجر یا بزنس مینجر رکھ لیں، مگر اس جائز مطالبہ پر کان دھرنا تو کجا، کہنے والوں کو بُری طرح جھڑک دیا جاتا ہے سیلز مینجر کی تقرری سے کونسل پر کوئی بار نہیں پڑے گا۔ بلکہ کونسل کو فائدہ پہنچے گا۔ اس کی کوششوں سے تصویریں زیادہ فروخت ہوں گی کونسل کو زیادہ کمیشن ملے گا۔ مگر آنکھ کے اندھے گانٹھ کے پورے چودھریوں کی سمجھ میں یہ بات آج تک نہیں آئی۔

کونسل والوں سے جب بھی بزنس مینجر رکھنے کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ تو ان کی طرف سے ایک ہی جواب ملتا ہے "ہمارے پاس ایسی کوئی گیلری نہیں ہے۔ جہاں فروخت ہونے والی تصویریں رکھی جا سکیں۔ اچھا چلئے ہم آپ کی اس بات کو تسلیم کئے لیتے ہیں، مگر ذرا یہ تو بتایئے کہ کونسل ہال میں اگر ریسٹ روم کی جگہ نکل سکتی ہے تو کمرشل آرٹ گیلری کی جگہ کیوں نہیں نکل سکتی۔؟ کونسل کی عمارت میں یہ ریسٹ روم، خاصے مزے کی چیز ہے اسرار و رومانس کا دبیز پردہ پڑا ہے

ڈرامہ اور کھیل

ڈرامہ اور تمثیلات کے میدان میں کونسل کی کارکردگی بھی ازحد شرمناک رہی ہے۔ کونسل نے آج تک جتنے ڈرامے اسٹیج کروائے وہ مالی اعتبار سے فلاپ ہوئے۔ ڈرامہ کے فن کو ترقی دینے میں کونسل نے کوئی کام نہیں کیا۔ جس کے نتیجے میں کونسل ۶۵-۱۹۶۴ء میں ایک ہزار ۳ سو ۳ روپے ۶۶-۱۹۶۵ء میں ایک ہزار ۸ سو ۹۳ روپے اور سب سے زیادہ ۶۹-۱۹۶۸ میں ۲۱ ہزار ۳ سو ۹۷ روپے کے اخراجات یا نقصان برداشت کرنا پڑا کونسل کے زیر انتظام ڈراموں کی ناکامی کی سب سے بڑی وجہ فری پاس بتائی گئی ہے۔ کونسل کے ۳۶۱ ممبر دل کھول کر اپنے ملنے جلنے والوں کو پاس جاری کرتے ہیں۔

کونسل کے ملازمین کی تنخواہوں میں تدریج ۹۰۰ فی صد کا اضافہ ہوا ہے۔ اور دفتری اخراجات میں گذشتہ گیارہ سالوں کے دوران ۱۰۰۰ فیصد کا غیر معمولی اضافہ بھی انتہائی حیرت انگیز ہے۔ ۶۰-۱۹۵۹ء میں کونسل اسٹاف کی تنخواہ کی مجموعی رقم ۴،۲۲،۶ روپیہ تھی جو ۶۲-۱۹۶۱ء میں اچانک بڑھ کر ۶،۹۰۶، ۲۴ روپے ہو گئی۔ ۱۹۶۹-۷۰ء میں ۹۳ ۲،۴ ۵ کی رقم تو آسمان پر پہنچ گئی۔ یہی حال دفتر کے اخراجات کا ہے۔ ۶۰-۱۹۵۹ میں ۱۰ ہزار ایک سو ۶ ۵ روپے خرچ ہے۔ جب کہ ۶۴-۱۹۶۳ء میں ایک لاکھ ۳ ہزار ایک سو ۸۵ روپے خرچ کئے گئے۔ ۶۹-۱۹۶۸ میں ایک لاکھ، ۱۴ ہزار ۴ سو ۸۰ روپے خرچ ہوئے۔

مذکورہ بالا اعداد و شمار پیش کرنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ کونسل والے اپنی تنخواہ اور دفتری اخراجات پر دل کھول کر پیسہ لٹاتے ہیں۔ لیکن فنی اور ثقافتی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی پر ایک پیسہ بھی خرچ کرتے ہوئے کڑھتے ہیں۔

آرٹس کونسل کے ارکان

آرٹس کونسل کے ارکان کی تعداد ۳۶۱ ہے۔ کونسل کے نائب صدر مسٹر یونس سعید موجودہ تعداد میں ایک فیصد کا اضافہ بھی گوارا نہیں کرتے۔ اُن کا خیال ہے "اگر ارکان کی تعداد میں اضافہ کیا گیا تو کونسل کی کارکردگی متاثر ہو گی۔ کونسل کا موجودہ معیار نیچے گر جائے گا"۔ موصوف فنون لطیفہ سے دلچسپی رکھنے والے عام آدمی کو ممبر شپ دینے کے سخت خلاف ہیں۔ ایوب خاں کی طرح عوام سے خائف ہیں۔ اُن کے خیال میں "عام لوگ ان کلچرڈ ہوتے ہیں۔ فن کی نزاکت اور باریکیوں کو سمجھنے کے اہل نہیں ہوتے"۔ ایک بار جب اُن سے ارکان کی تعداد بڑھانے کا سوال کیا گیا تو انہوں نے بھاری مُنہ سے جواب دیتے ہُوئے کہا " ہم آرٹس کونسل کے ممبروں کو ایک بے ہنگام ہجوم میں تبدیل کرنا نہیں چاہتے۔ مختلف خیالات اور نظریات کے لوگوں کو بیک وقت مطمئن کرنا ہمارے لئے مشکل بات ہو گی"۔

یہی سوال جب ایگزیکٹو ڈائریکٹر مسٹر عرفان سے کیا گیا تو انہوں نے جواب دیا "کونسل کی گورننگ باڈی نے جون ۱۹۶۹ء میں ایک قرارداد منظور کی تھی۔ جس کے مطابق نئی ممبر سازی اُس وقت تک کے لئے روک دی گئی جب تک کونسل کے وسائل اس بات کی اجازت نہیں دیتے۔" کونسل کی موجودہ صورتِ حال یہ ہے کہ متمول لوگوں کی درخواستیں اس خوف سے مسترد کر دی جاتی ہیں کہ اگر انہیں ممبر بنا لیا گیا تو وہ کونسل پر قابض ہو جائیں گے۔ دوسری طرف غریب فنکاروں کے ممبر فارم یہ کہہ کر ٹھکرا دیا جاتا ہے کہ "وہ غریب ہیں اور کونسل کی فلیس برداشت نہیں کر سکتے"۔

عام سالانہ اجلاس میں جو رپورٹ پیش کی گئی اس کے مطابق گذشتہ چار سالوں کے دوران ۱۹۱ ننے امیدواروں کے فارم مسترد کئے گئے۔ اس طرح کونسل ۴ ہزار ۷ سو ۷۵ روپے سے محروم ہو گئی۔ جن لوگوں کے فارم مسترد کئے گئے۔ انہوں نے مقامی عدالت میں مقدمہ دائر کر رکھا ہے۔ کونسل سینکڑوں روپے مقدمے کی پیروی میں خرچ کر رہی ہے۔

مسٹر یونس سعید ترقی پسند خیالات کے بھلے آدمی ہیں۔ وہ یقیناً اس بات کے حامی ہوں گے کہ فن اور عوام کے درمیان گہرا رشتہ قائم ہونا چاہیئے۔ لیکن بدقسمتی سے وہ آرٹس کونسل کے پیر تسمہ پا کے پھیلائے ہوئے جال میں اسقدر اُلجھے ہُوتے ہیں کہ اُن کے متعلق بھی قیاس

آرائیاں اور شکوک و شبہات جنم لے رہے ہیں۔ کیا وہ سمجھتے ہیں کہ:

الف: کراچی میں فنونِ لطیفہ سے دلچسپی اور لگاؤ رکھنے والے صرف ۳۶۱ افراد ہیں۔ اور اس شہر کے جتنے لوگ ہیں وہ جاہل اور گنوار ہیں۔

ب۔ کیا آرٹس کونسل فن و ثقافت کے چند نام نہاد گنے چنے پنڈتوں، پیروں کی جاگیر ہے؟ کیا اس شہر کے ہزاروں، لاکھوں افراد، آرٹس کونسل کے معاملات میں دلچسپی لینے کا حق نہیں رکھتے؟

ج: کیا آرٹس کونسل کی موجودہ صورتِ حال ایوبی آمریت سے کم و بیش ملتی جلتی نہیں۔ ایوب کے دورِ اقتدار میں ملک پر بنیادی جمہوریت کے ۸۰ ہزار افراد کا قبضہ تھا اور آرٹس کونسل پر ۳۶۱ افراد کا قبضہ ہے؟

د: کیا آرٹس کونسل جیسے ثقافتی مرکز کو جمہوری بنیاد پر نہیں چلایا جا سکتا۔ کیا اس کے دروازے فنونِ لطیفہ سے دلچسپی رکھنے والے ہر خاص و عام پر کھولے نہیں جا سکتے۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ آرٹس کونسل کی موجودہ صورتِ حال سے آرٹ کی کوئی خدمت ہو سکتی ہے؟

اصلاح احوال کی کیا صورت ہو

آرٹس کونسل کے حالات درست کرنے اور اسے ۳۶۱ پنڈتوں پیروں اور جاگیرداروں سے نجات دلانے کے دو طریقے ہیں پہلا طریقہ جمہوری ہے اور دوسرا طریقہ انقلابی۔ پاکستان کے عوام ان دونوں تجربوں سے بار بار گذر چکے ہیں آمروں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لئے عوامی تحریک شروع کی جاتی ہے۔ آرٹس کونسل کا معاملہ اتنا بڑا اور سنگین نہیں جس کے لئے عوامی تحریک کی ضرورت پیش آئے، البتہ اس ثقافتی ادارہ پر قابض چند کلچرل وڈیروں کے سیاہ کارناموں کو دانشگاف کرنے کی ضرورت ہے۔ تاکہ پاکستان۔ بالخصوص کراچی کے عوام یہ اچھی طرح سے جان لیں کہ بنیادی جمہوریت کی طرح ثقافت کے ۳۶۱ ثقافتی ٹھیکیدار ادب، فن اور ثقافت کو عوام سے دور رکھنے کی گھناؤنی سازش میں مصروف ہیں۔ کونسل کا عام اجلاس بلایا جائے اس میں ایسے مسائل اور معاملات پر غور کیا جائے جو اس عوامی ادارہ کو عوامی سطح پر لا سکیں۔ اور جو اس شہر کے ۳۰۔ لاکھ افراد کی تہذیبی اور ثقافتی سرگرمیوں کی صحیح معنوں میں نمائندگی کر سکے۔

وقت کی صدا

ناصر زیدی

چلو! وطن پھر بُلا رہا ہے
اٹھو! کہ ہر شہر جاگ اُٹھا ہے
کہو! جو، ہر عہد میں کہا ہے
سُنو! کہ یہ وقت کی صدا ہے

نظامِ حُسنِ چمن کی خاطر
ہم اپنی جانیں نثار کر دیں

ستم گروں کے نشاں مٹا دیں
خیامِ اہلِ جفا جلا دیں
شعورِ رزم و وغا دکھا دیں
اُٹھیں تو محشر نیا اُٹھا دیں

پھر اپنے پیارے وطن کی خاطر
ہم اپنی جانیں نثار کر دیں

لہو سے سینچیں نئی بہاریں
ہر ایک گل کا بدن نکھاریں
روش روش کا چلن سنواریں
دلوں میں جذبے نئے اُبھاریں

جمالِ سرو و سمن کی خاطر
ہم اپنی جانیں نثار کر دیں

لگا کے نعرہ وطن کا دَم دَم
نکل پڑیں جب اُٹھا کے پرچم
مٹا کے رکھ دیں عدو کا دم خم
نویدِ نصرت سُنائیں پیہم

وطن کی خاطر، چمن کی خاطر
ہم اپنی جانیں نثار کر دیں





منشی کنہیالال کا انقلاب سبیتا کے قہقہوں میں ڈوب گیا

ممتاز فلمساز و ہدایت کار ضیاء سرحدی نے الفتح کے لئے لکھا

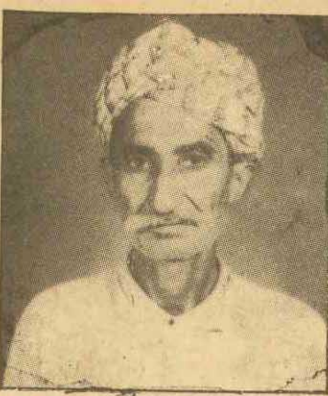
چند روز کے بعد سہرابدرانا تندرست یاب ہو کر اسٹوڈیو آنے جانے لگے اور محبوب نے اپنی شوٹنگ کا سلسلہ پھر سے شروع کر دیا۔ مجھ کو ساگر میں کام کرتے ہوئے اب سات آٹھ ماہ گزر چکے تھے۔ اور اس عرصہ میں ساگر کے سٹاف کے لوگوں کے ساتھ میرے خاصے تعلقات ہو چکے تھے۔ محبوب کے یونٹ کے علاوہ ساگر کے دوسرے ہدایت کار اور ان کے مخصوص عملے سے بھی میرا میل جول بڑھ گیا تھا۔ اور اس وجہ سے میں ان تمام لوگوں سے جس قدر ہو سکتا تھا فلم سازی کے مختلف خدوخال کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔ اسی زمانے میں ہدایت کار بادامی ڈاکٹر مدھوریکا نام کی ایک تصویر بنا رہے تھے۔ اور اس کی کہانی انڈین نیشنل کانگرس کے ایک مشہور رہنما منشی کنہیا لعل کی تصنیف کردہ تھی منشی کنہیا لعل سیاست دان ہونے کے علاوہ کئی ناولوں کے مصنف بھی تھے۔ اور گجراتی پبلک میں ان کی علمی اور ادبی دسترس کے بڑے چرچے تھے۔ اور ان کے حق میں ساگر کے لوگوں کا بھی یہ خیال عام تھا کہ وہ اگر فلم کی صنعت اور فن میں باقاعدہ دلچسپی لیتے رہے اور اس کے لئے کہانیاں لکھتے رہے تو فلم کی ساخت پرداخت میں خاصا انقلاب لے آئیں گے۔ چنانچہ اس طرح کی باتیں سن سن کر میرے اندر شدید خواہش پیدا ہوئی اور میں نے بادامی سے درخواست کر دی کہ وہ مجھ کو منشی جی کا سکرپٹ پڑھنے کا موقع دیں۔ بادامی نے دوسرے یا تیسرے روز مجھ کو اس کی ایک کاپی دے دی اور میں نے اس کا بڑے غور و فکر کے ساتھ مطالعہ شروع کر دیا۔

ڈاکٹر مدھوریکا کی کہانی جب میں نے پڑھ لی اور اس کے فلمی مسودے کے ہر پہلو پر میں نے غایت درجہ غیر جانبداری اور خلوص کے ساتھ غور کر لیا تو میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ اگر یہی کہانی منشی جی کے علاوہ کسی اور کی لکھی ہوتی تو اس کے بارے میں یہ کہا جا سکتا کہ وہ ایک اچھی اور مناسب کوشش ہے۔ مگر منشی جی کے سیاسی اور انقلابی پس منظر کے پیش نظر میری توقعات یہ نہیں تھیں کہ وہ اپنی کہانی کے بنیادی کردار، لیڈی ڈاکٹر مدھوریکا اور اس کے شوہر (جو شاید وکیل تھے)، کی زندگیوں کے چند سطحی پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی حد تک ہی اپنے قلم کو محدود کر دیں گے۔ میں تو یہ سمجھے بیٹھا تھا کہ منشی جی نے ان کردار کا زاویہ منتخب کر کے معاشرے کی کوئی ٹھوس عکاسی کی ہوگی۔ ہندوستان کے اس دور کی سیاسی صورت حال پر روشنی ڈالی ہوگی۔ سامراج کے ساتھ ہندوستانی عوام کی جنگ کو اُبھارا ہوگا اور اس طرح سے سکرین پر بھی اپنے انقلابی دعووں کے کچھ نقوش پیش کئے ہوں گے۔ لیکن ڈاکٹر مدھوریکا میں اس وضع قطع کی کوئی بات نہیں تھی اور وہ ایک سطحی قسم کی ایسی تصنیف ہو کے رہ گئی تھی کہ جس کے بنیادی

کانگریسی سیاسی لیڈر
کی کہانی میری
توقعات پوری نہ کر سکی

کردار اکثر و بیشتر اپنی ازدواجی زندگی کے پیچ و خم میں کچھ اس یکطرفی کے ساتھ الجھے ہوئے تھے کہ مجھ کو وہ زندگی کے عالمگیریت سے بہت ہی ہٹے ہوئے معلوم ہوتے رہے۔ موتی لال نے اگرچہ اپنی لچکدار اداکاری سے کہیں کہیں دلچسپ تو ضرور بنا دیا تھا مگر کھوکھلی اور نرم ہدایت کاری اور سبیتا کی چوکنی پرفارمینس نے، موتی لال کی چند خوبیوں کو بھی ابرآلود کر کے چھوڑ دیا تھا۔ بہرحال مجھے منشی جی کی لکھی ہوئی اس تصویر نے حد درجہ مایوس کیا۔ اور اس کے قہقہہ انگیز عناصر بھی مجھ کو اتنے بھلے نہیں معلوم ہوتے ہندوستان کا وہ دور جس میں یہ تصویر بنی تھی ایک آتشیں اور انقلابی دور تھا۔ صوبہ سرحد سے لے کر راس کماری اور برما کی حدود تک برصغیر کے عوام اپنی سالہا سال کی غلامانہ زنجیروں کو توڑنے کی جدوجہد میں مصروف تھے۔ اور ایسے زمانہ میں وقت کا تقاضا یہی تھا کہ ہر صاحب قلم ہر صاحب فکر و نظر اور ہر حریت پسند اپنے اپنے میدان عمل میں عوام کی اس عالمگیر جدوجہد میں شرکت کرے۔ اور اس تحریک سے اپنے علم و ہنر بلکہ اپنی عزیز چیز کو وابستہ کر دے۔ جس میں برصغیر کے مظلوم اور مجبور عوام کا تمام تر مستقبل مضمر تھا۔ لیکن ڈاکٹر مدھوریکا میں اشارے کنائے کے رنگ میں بھی یہ بات موجود نہیں تھی۔ اس سلسلہ میں میرے اندر اکثر یہ خواہش پیدا ہوتی رہی کہ اگر موقع مل سکے تو میں بالواسطہ منشی جی سے کچھ گفتگو کر لوں۔ لیکن عملاً میں اس کی جرأت کبھی نہ کر سکا۔ اور وہ اس لئے کہ منشی جی کو ساگر کے مالکان وغیرہ نے کچھ ایسی آفاقی شخصیت بنا کے رکھ دیا تھا کہ وہ ساگر میں جب بھی تشریف لاتے اوپر ہی کی سطح کے چند لوگوں میں گھرے رہتے۔ اور بالعموم ساگر کے مالکان کے ہمراہ سبیتا دیوی کے خاص کمرہ میں پہنچ جاتے۔ جہاں سے کچھ دیر کے بعد سبیتا کے باریک قہقہوں کے ساتھ کچھ دوسرے ملے جلے قہقہے SYNCHRONISE ہوتے ہوتے سنائی دیتے اور مجھ کو اکثر یہ محسوس ہوتا کہ منشی جی کا انقلاب جیسے ان قہقہوں کے سمندر میں ڈوبا چلا جا رہا ہے۔

(باقی آئندہ)



کالو مل ولد لکھو مل

صدرِ مملکت! اِن کی بھی سنیئے

انصاف مہنگا ہے۔ عوام غریب ہیں

نمائندہ الفتح

وہ ایک ۶۰ سالہ بوڑھا چھپری والا تھا، اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی جھریاں اس کے ماضی کی پُرپیچ اور غربت کی داستان سنا رہی تھیں اس کے نحیف و نزار بازوؤں کی ابھری ہوئی رگیں، دھنسی ہوئی آنکھیں اور آواز کی کپکپاہٹ اس بات کی عکاس تھی کہ اسے زندگی میں دکھوں کے سوا کچھ اور نہیں ملا۔ اور اب جب کہ وہ موت اور زندگی کی سرحد پر کھڑا تھا تو زندگی کے آخری مرحلے میں بھی استحصالی طبقوں نے اسے رنج والم کی دولت سے مالا مال کر دیا۔

بوڑھے کالو مل ولد لکھو مل چھپری والے نے بتایا کہ وہ ضلع تھرپارکر کے گاؤں محمد حسن بھرگری ارارو تعلقہ سامرو میں رہتا ہے۔ عدل و انصاف کی تلاش میں کراچی آیا ہے۔ وہ گورنر سندھ سے ملنا چاہتا تھا وہ دو دن تک گورنر ہاؤس کا طواف کرنے کے باوجود اسے گورنر کے سامنے پیش نہ کیا گیا۔ بمشکل گورنر ہاؤس کے سیکشن آفیسر تک رسائی ہو سکی انہوں نے ۳۱۔ اگست ۱۹۷۱ء کو کالو مل کی درخواست ضروری کارروائی کے لئے کمشنر حیدر آباد کو بھیج دی۔

کالو مل کا خاندان گذشتہ ایک سو سال سے محمد حسن بھرگری ارارو میں آباد ہے۔ قیام پاکستان کے بعد بھی اس نے سندھ کی دھرتی کو چھوڑنا گوارہ نہ کیا۔ سر چھپانے کو آبائی مکان موجود تھا۔ چنانچہ وہ چھپری لگا کر گذر بسر کرتا رہا۔ کوئی چھ ماہ قبل رات کے نو دس بجے، عبدالرزاق، عبداللہ، واحد بخش نبی بخش، عمر، محمد رحیم، لیق، مرید، بھالو اور سالار نامی افراد کلہاڑیوں اور لاٹھیوں سے مسلح اس کے گھر زبردستی گھس گئے، کالو مل کو زدوکوب کیا اور اُٹھا کر باہر پھینک دیا، کالو مل کا مال متاع جو ایک جھگڑے چارپائی اور بستر پر مشتمل تھا، چھین لیا، گھر کے صحن میں لگے ہوئے تمام درختوں کو کاٹ دیا۔ اور پورا مکان مسمار کر دیا۔

کالو مل نے بتایا جن افراد نے اسے جبراً بیدخل کیا ہے وہ اس کے مکان میں آٹے کی چکی لگانا چاہتے ہیں اور اس مقصد کے لئے انہوں نے اس کا مکان مسمار کر کے ایک دیوار بھی تعمیر کر لی ہے۔ تمام افراد علاقے کے مشہور بدمعاش ہیں، عبدالرزاق ہسٹری شیٹر ہے غنڈہ ایکٹ کے تحت سزا بھی پا چکا ہے اور ضلع بدر بھی ہو چکا ہے، نبی بخش مارشل لاء کی دفعات کے تحت بندوق کی گولیاں رکھنے کے جرم میں سزا پا چکا ہے، لیق بکریاں چوری کرنے کے جرم میں جیل جا چکا ہے۔ عمر اور مرید بھی ہسٹری شیٹر ہیں۔ اور کالو مل کو دھمکی دی ہے کہ اگر وہ جان کی سلامتی چاہتا ہے تو گاؤں سے چلا جائے اور اپنا مکان دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش ترک کر دے

کالو مل اپنے مکان کا ٹیکس ارارو بھرگری کی یونین کونسل کو دیا کرتا تھا۔ چنانچہ وہ ٹیکس کی ادائیگی کی رسیدوں اور واقعہ کے چشم دید گواہ، محمد صدیق بھرگری، تم کھاس خیلی، عبداللہ بھرگری، وارگنگ کلہی کی ہمراہی میں مختار کار اور اسسٹنٹ کمشنر سے ملا دونوں نے مدعا الیہ کے نام نوٹس جاری کئے مگر وہ عدالت میں حاضر نہیں ہوئے۔ چنانچہ مختار کار اور اسسٹنٹ کمشنر نے مدعا الیہ کے خلاف اپنی رپورٹ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور ڈپٹی کمشنر تھرپارکر کو دے دی دونوں افسروں کے دفتروں میں یہ رپورٹس پڑی ہیں۔ کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔ کیونکہ کالو مل کے مخالفین بارسوخ ہیں اور علاقہ کے بعض بڑے وڈیرے ان کی حمایت کر رہے ہیں، اس پر کالو مل نے ۲۰۔ اپریل ۱۹۷۱ء کو گورنر سندھ کو ایک تار بھیجی۔ اور درخواست بھی دی، لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔

اب کالو مل نے صدر پاکستان سے انصاف مانگا ہے۔ غربت اور افلاس کے باعث وہ سول عدالتوں سے رجوع نہیں کر سکتا، کیونکہ انصاف بہت مہنگا ہے۔

جیمز کونلی: صفحہ ۱۰ سے آگے

نے لکھا "ایک قوم کی آزادی نچلے طبقے کی آزادی سے ناپی جاتی ہے"۔

کونلی نے آئرلینڈ کے ہر صنعتی تنازعہ کو طبقاتی رنگ دیا اور آئرش سٹیزن آرمی کو طاقتور بنایا۔ ۲۴ر اپریل ۱۹۱۶ء کو انتہا پسند آئرش رضا کار، جو متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے، آئرش سٹیزن آرمی میں شامل ہو گئے۔ کونلی نے "آئرش ری پبلک" کے قیام کا اعلان کر دیا۔ برطانیہ کے نزدیک آئرش جمہوریہ کا قیام "غداری" کے مترادف تھا، برطانوی فوج حرکت میں آ گئی۔ آئرش سٹیزن آرمی بھی مقابلے میں ڈٹ گئی۔ لیکن آئرش رضا کاروں کی اکثریت متوسط طبقے سے تعلق کی وجہ سے اس جدوجہد میں شریک نہ ہوئی۔ کل ایک ہزار رضا کاروں نے اس انقلابی جنگ میں آئرش سٹیزن آرمی کا ساتھ دیا۔ آئرلینڈ کے محنت کشوں نے کونلی کی قیادت میں پانچ دن تک، بازاروں، سڑکوں، گلیوں اور کوچوں میں برطانوی فوجوں سے پامردی اور بہادری سے مقابلہ کیا۔ کونلی بھی دو بدو لڑا۔ لیکن افرادی قوت کی کمی اور مختصر وسائل کی وجہ سے یہ انقلابی تحریک کامیاب نہ ہو سکی۔ کونلی سخت زخمی حالت میں گرفتار ہوا۔ جسے ۱۲ر مئی ۱۹۱۶ء کو گولی سے اُڑا دیا گیا۔

اب ۵۵ سال کے بعد کونلی اور ۲۴ر اپریل ۱۹۱۶ء کو آئرلینڈ کی سڑکوں پر بہنے والا محنت کشوں کا خون رنگ لا رہا ہے۔ شمالی آئرلینڈ کے محنت کش اور مظلوم طبقے ایک مرتبہ پھر آزادی کے لئے اپنے خون سے سڑکیں رنگین کر رہے ہیں۔

الفتح

سٹار نیوز ایجنسی نے

فوجی انقلاب کی خبر پہلے سے تیار کرلی تھی

افضل صدیقی

یہ ساتویں اکتوبر ۱۹۵۸ء کا ذکر ہے میں حسب معمول صبح ۹ بجے کام کرنے کے لئے اسٹار نیوز ایجنسی کے دفتر پہنچا۔ اس وقت آفس اسسٹنٹ شفیق نذیری نے جو آجکل اقوام متحدہ کے دفتر اطلاعات (کراچی) میں کام کرتے ہیں، دو خبروں کا ایک اسٹینسل ٹائپ کر لیا تھا۔ اور ڈپلی کیٹنگ مشین پر وفتری نے اس کی چھپائی شروع کر دی تھی۔ کرسی پر بیٹھتے ہی ایک کاپی ترجمہ کے لئے اس نے میرے سامنے رکھ دی۔ میں نے اسٹینسل نکالا اور فولادی قلم نکال کر خبر پر نظر ڈالی۔ سُرخی پڑھتے ہی میں ٹھٹھک گیا۔ سُرخی یہ تھی۔

A CHANGE KNOCKS AT THE DOOR OF PAKISTAN.

(انقلاب پاکستان کے دروازے پر دستک دے رہا ہے)

خبر پڑھی تو یہ عام نوعیت کی خبر تھی۔ پاکستان کو بدنام کرنے اور دنیا کی نظروں میں اس کی گرتی ہوئی ساکھ کی وضاحت کرنے کا ٹھیکہ ان دنوں بھی برطانوی اور امریکی اخبارات نے لے رکھا تھا۔ اور آئے دن پاکستان کے خلاف گمراہ کن خبریں ان اخبارات میں چھپتی رہتی تھیں۔ پاکستان کے سیاسی حالات اس وقت بھی بہت دگرگوں۔ لوگ رات بھر سو کر صبح جاگتے تھے تو ایک نئے وزیر اعظم کا چہرہ اخبار میں دیکھتے تھے۔ سیاسی آویزشیں عروج پر تھیں۔ اسکندر مرزا کی زیر قیادت سیاسی گھڑ دوڑ تیزی سے جاری تھی۔ بساط سیاست پر بکھرے ہوئے مہروں کو پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ انہیں کب کس نے اور کس مقصد کے لئے استعمال کر ڈالا۔

وہ زمانہ ملک فیروز خاں نون کی وزارت عظمیٰ کا تھا۔ اور انہیں گدی سنبھالے بھی زیادہ دن نہیں گزرے تھے۔ سیاسی پنڈتوں نے ابھی سے پیش گوئیاں شروع کر دی تھیں کہ نون صاحب چند دن کے مہمان ہیں۔ اقتصادی طور پر ملک تقریباً دیوالیہ ہو چکا تھا۔ لوٹ کھسوٹ کا دور دورہ تھا۔ لوگ بے یقینی اور مایوسی کی گہری کُہر میں لپٹے ہوئے تھے۔ مہنگائی، چور بازاری، اسمگلنگ، ذخیرہ اندوزی اور دوسری بے شمار خرابیاں ملک کو دیمک کی طرح چاٹ رہی تھیں۔ سیاسی اور معاشرتی ڈھانچہ ریزہ ریزہ ہو چکا تھا۔ اپنے ملک کی پل پل کی خبر دنیا کے گوشے گوشے میں پھیل رہی تھی۔ باوجود اس امر کے کہ اب سے تیرہ سال پہلے عالمی برادری کے لوگ ایک دوسرے کے اتنے قریب نہیں آئے تھے کہ ایک کی سانسوں کی آواز دوسرا سن سکے۔ امریکہ، برطانیہ، بھارت اور دوسرے سامراجی ملکوں کے جاسوس، اخبار نویسوں، ثقافتی طائفوں، کیبرے ڈانسروں، سفارتی نمائندوں، سیاست دانوں، ماہروں اور بہی خواہوں کے روپ میں کھلے عام دندناتے پھرتے تھے۔ یہ سب کے سب مختلف حیثیتوں سے ہماری زندگی میں اس طرح رچ بس گئے تھے کہ مختلف شعبوں میں ان کا وجود ناگزیر لگتا تھا۔ باہر کے اخباروں کی مرضی میں جو آتا تھا چھاپتے تھے۔ اور اپنے ملک میں ان کی رپورٹیں ثقہ اور قابل اعتماد سمجھی جاتی تھیں۔ فوج سیاست سے الگ تھلگ تھی۔ فوجی آدمی کا عوامی زندگی میں کوئی دخل نہیں تھا۔ فوجی وردی ایک مافوق الفطرت کا ملبوس تصور کی جاتی تھی۔ کسی کے ذہن کے قریب ہو کر بھی یہ بات نہیں گذرتی تھی کہ فوج ملکی انتظامی امور میں حصّہ لینے پر مجبور ہو سکتی ہے۔

مغربی طرز کی پارلیمانی جمہوریت کی شراب خالص مشرقی اور ایشیائی پیمانوں پر جس طرح ڈھل کر آئی تھی اس سے ان پیمانوں کی آب و تاب کجلا گئی تھی۔ کوئی دم جاتا تھا کہ یہ تنخ کر چُور چُور ہو جاتے اس عالم میں میرے سامنے یہ خبر آئی تھی کہ "انقلاب پاکستان کے دروازے پر دستک دے رہا ہے"۔ اور خبر کے متن میں جس انقلاب کا اندیشہ ظاہر کیا گیا تھا وہ فوجی انقلاب تھا۔ اور یہ خبر برطانیہ کے ثقہ اخبار ڈیلی ٹیلیگراف کے اداریئے سے بنائی گئی تھی۔ جو اس اخبار کی ۵ اکتوبر ۱۹۵۸ء کی اشاعت میں چھپا تھا۔

یہ خبر عثمان صدیقی کے باس اسٹار نیوز ایجنسی کے سربراہ ایس جے ڈبلیو کولنز نے خود تیار کی تھی۔ اور باقاعدہ ٹیلی گراف کے اداریئے کا حوالہ بھی دیا تھا۔ اس قسم کی خبریں اسٹار نیوز ایجنسی عموماً جاری نہیں کیا کرتی تھی بلکہ سیاسی خبروں سے گریز ہی کیا کرتی تھی کہ کہیں اس کی زیر زمین سرگرمیوں کی قلعی نہ کھل جائے۔ ان سرگرمیوں کی ہوا بھی کسی کو نہ لگتی تھی۔ کولنز اسکاٹ تھے، اسکاٹ لینڈ کے رہنے والوں کو تسنعلیق اور شریف الطبع سمجھا جاتا ہے۔ کولنز تھے بھی ایسے ہی۔ بڑے مرنجاں مرنج، ملئے دیئے رہنے والے جیسے خاص لکھنؤ سے اُٹھ کر آگئے ہوں۔ چہرے پر پورب کے باسیوں کی سی جالشکارے مارتی تھی کوئی قیاس بھی نہیں کر سکتا تھا کہ ایسا آدمی کوئی شرارت بھی کر سکتا ہے مگر درحقیقت ایسے ہی آدمی شرانگیزی کے لئے موزوں سمجھے جاتے ہیں۔ میں نے کولنز کو کسی چپراسی پر بھی تیز آواز سے بگڑتے نہیں دیکھا تھا۔ عثمان صدیقی ایڈیٹر انچارج باس باس کر کے ان سے یوں بعض اوقات گفتگو کرتے تھے جیسے وہ کولنز کے باس ہوں مگر مجال ہے کہ کولنز کے ماتھے پر شکن آجائے۔

"خبر میں باوثوق ذرائع کے حوالے سے بتایا گیا تھا کہ پاکستان کے موجودہ سنگین حالات کو فوج تشویش کی نظروں دیکھ رہی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسے کسی حاسمہ لمحے کا انتظار ہے جب اس کے لئے سیاسی پیش منظر پر اُبھر آنا لازمی ہو جائے گا۔ عام لوگ بھی اب فوج کو مرض کہن کا آخری چارہ سمجھنے لگے ہیں اور سفارتی حلقوں میں بھی یہ خیال زور پکڑتا جا رہا ہے کہ فوج نے اگر مداخلت نہیں کی تو پھر پاکستان کو تباہ ہونے سے کوئی نہیں روک سکے گا۔"

اتنی مدت پہلے کی خبر کے اصل الفاظ تو مجھے یاد نہیں لیکن مفہوم قریب قریب یہی تھا۔ میں نے کولنز سے تو کچھ نہیں کہا۔ عثمان صدیقی کے پاس گیا اور ان سے کہا "آپ نے خبر ملاحظہ کر لی ہے؟" انہوں نے جواب دیا

صرف روزنامہ "انقلاب" میں فوجی انقلاب کی خبر نہیں تھی

"ڈونٹ بی فلش" (احمقانہ بات مت کرو) اور میں چپ چاپ اپنی سیٹ پر آ کر خبر کا ترجمہ کرنے لگا۔ میں نے سمجھ لیا کہ اس خبر کے بارے میں کولز اور عثمان صدیقی کے درمیان کھٹ پٹ ہو چکی ہے۔ اور میری سلامتی اسی میں ہے کہ میں خاموش رہوں۔ میں نے اسٹینسل کاٹا اور دفتری کو مشین پر چڑھانے کے لئے دے دیا۔ دم بھر میں سو کاپیاں تیار ہو گئیں۔ گھنٹہ بھر کے اندر ڈاک اخباروں کو تقسیم کے لئے جانے والی تھی کہ کولز کو کوئی ٹیلیفون ملا۔ کمرہ کے اندر سے گفتگو تو باہر نہیں سنائی دے سکتی تھی البتہ زور سے ٹیلی فون رکھنے کی آواز ضرور آئی۔ اور اس کے ساتھ ہی کولز اپنے کمرے سے گھبرائے ہوئے نکلے اور لپکتے ہوئے عثمان صدیقی کے کمرے میں چلے گئے اور پھر دونوں باہر آئے اور پھر انگریزی اردو اسٹینسل، ان کی ساری کاپیاں اور مشین سے نکلی ہوئی ردی کے بکس میں پڑی خراب کاپیاں سب ایک ایک کر کے جمع کرنے لگے۔ شفیق سے اور مجھ سے کہا کہ "اس خبر کی نقل کسی طرح بھی باہر نہ جانے پائے۔" ویسے بھی یہ بات صحافتی دیانت کے منافی تھی۔ کہ خبر جاری ہونے سے پہلے باہر کے کسی ذریعہ کو بتا دی جاتی اور اب تو خیر اس کی خاص طور پر تاکید کر دی گئی تھی لہذا کسی سے اس کے ذکر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے شفیق کی طرف دیکھا اور پھر ہم دونوں کولز اور عثمان صدیقی کی ہیئت کذائی پر مسکرانے لگے۔ جو ابھی تک کمرے کے کونے کھدرے میں خبر کی ایک ایک کترن بٹورتے پھر رہے تھے۔

بعد میں پتہ چلا کہ وہ ٹیلی فون پرنسپل انفارمیشن آفیسر مسٹر گلس کا تھا اور انہوں نے کولز کو ہدایت کی تھی کہ اس بات کا خاص خیال رکھا جائے کہ فوج کے بارے میں کوئی خبر جاری نہ ہونے پائے۔ کولز نے ڈیلی ٹیلیگراف کی خبر بیان سے تبادلہ خیال کیا جو شاید پہلے ہی ڈگلس صاحب کے علم میں آ چکی تھی اور غالباً اے پی پی اور پی پی اے (موجودہ پی پی آئی) میں بھی پہنچ چکی تھی اور ان ایجنسیوں نے اسے ابھی کریڈ نہیں کیا تھا۔ یہ ساری باتیں دوسرے دن معلوم ہوئیں۔ اس روز تو میں شام تک اسٹار ایجنسی میں کام بھگتا کر ۶ بجے نائٹ شفٹ میں کام کرنے "امروز" آ گیا۔ اسٹار نیوز ایجنسی کا دفتر اسپنسر بلڈنگ (میکلوڈ روڈ) میں تھا اور امروز کے دفتر پہنچنے میں یہاں سے دو منٹ لگتے تھے۔ امروز، پاکستان ٹائمز لاہور کا سب آفس آج بھی اس عمارت میں مارننگ نیوز کے برابر ہے جہاں سے پہلے امروز کراچی نکلتا تھا۔ دفتر پہنچ کر میں نے معمول کے مطابق کام شروع کر دیا۔ اس روز یعنی ۷ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو شفٹ انچارج حیدر علی خاں تھے جو آجکل امروز لاہور کے نیوز ایڈیٹر ہیں۔ اس زمانے میں ان کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے عجیب قلندرانہ شان رکھتے تھے۔ کئی کئی گھنٹے دفتر سے غائب ہو جاتے تھے جس جگہ ان کے پائے جانے کا یقین ہوتا تھا وہاں انہیں بلانے کے لئے چپراسی کو بھیجا جاتا تھا تو وہ بھی انہی کے ساتھ بیٹھ جاتا تھا۔ اس روز حالات کی طرح حیدر صاحب بھی نارمل تھے۔ خبریں تیزی سے بن رہی تھیں اور شعبۂ کتابت میں پہنچ رہی تھیں رات نو بجے کے قریب ہم لوگ کھانا کھانے بیٹھے تو ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ محمود احمد نے فون سنا ان ہی کے کسی عزیز کا تھا جو یہ معلوم کرنا چاہ رہے تھے کہ فوج شہر میں گشت کر رہی ہے۔ محمد احمد نے انہیں بتا دیا کہ یہ بے بنیاد اطلاع ہے۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے اور وہ پھر کھانے میں شریک ہو گئے تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ اسٹاف رپورٹر آصف جیلانی دفتر میں آ دھمکے۔ وہ سینما کا شو دیکھ کر آئے تھے ان سے پوچھا گیا کہ اس قسم کا ایک ٹیلیفون آیا تھا۔ یہ بات کہاں تک درست ہے؟ انہوں نے کہا کہ "میں تو فلم شو دیکھ کر آ رہا ہوں اور میں نے شہر میں فوج کے گشت کے آثار نہیں پائے۔" ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک اور فون آیا۔ کوئی صاحب یہ اطلاع دے رہے تھے کہ ریڈیو پاکستان پر فوج کا پہرہ ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ اب ہمیں تردد ہوا۔ آصف جیلانی کو

ضروری وضاحت

مضمون کی پچھلی قسط میں لکھا گیا تھا کہ اسٹار نیوز ایجنسی کے سابق ایڈیٹر انچیف عثمان صدیقی ملبورن آسٹریلیا میں ہیں لیکن پچھلے ہفتہ بی بی سی کی اوورسیز سروس کے نمائندے اطہر علی سے معلوم ہوا کہ وہ ملبورن سے اوٹاوہ کینیڈا چلے گئے ہیں پہلے عثمان صدیقی چار سال تک ملبورن ہیرلڈ میں کام کرتے رہے۔

ریڈیو پاکستان دوڑایا۔ کیوں کہ ریڈیو والے فون پر کوئی جواب نہیں دے رہے تھے۔ ابرار صدیقی گھر پر موجود نہیں تھے۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹے بعد آصف جیلانی اور جعفر نقوی دفتر آئے تو پتہ چلا کہ ایوان صدر اور ریڈیو پاکستان کے علاوہ ایئرپورٹ، بندرگاہ اور اہم مراکز پر فوج کا پہرہ ہے۔ اور کچھ ہونے والا ہے۔ ہم نے اپنے اخبار کے لئے لیڈ کی سرخی اور خبر لکھوالی تھی۔ اور حسب معمول پونے ۱۱ بجے آخری کاپی جڑنی شروع ہو گئی تھی۔ کہ اے پی پی کے پرنٹر پر ارجنٹ پیغام آیا۔ "اخبار روک لیا جائے اہم خبر کا انتظار کیجئے۔" اس پیغام کے ملتے ہی یہ اطمینان ہو گیا کہ فوج سیاسی ریشہ دوانیوں کے علاج کے لئے اپنا فرض ادا کرنے آ پہنچی۔ سارے اخبار صبح دیر سے چھپیں گے اس لئے پریشانی نہیں تھی۔ ٹھیک ۱۲ بجے ٹیلی پرنٹر چلنا شروع ہوا۔ متعدد بار سٹیپ سٹیپ لکھا ہوا نظر آیا۔ اور پھر یہ فقرہ ٹائپ ہونا شروع ہوا، "ملک میں فوری طور پر مارشل لاء نافذ کر دیا گیا ہے۔" ہم سب لوگ دم بخود پرنٹر کو گھیرے کھڑے تھے۔ اور پھر پندرہ بیس منٹ کے اندر خبر کی تفصیل آ گئی اور مارشل لاء کے ضابطوں کا اعلان ہونے لگا۔ ہم نے تیزی سے خبر کا ترجمہ شروع کر دیا۔ لکھی لکھائی لیڈ تلف کر دی گئی سیاری سیاسی خبریں لکھی لکھائی کاپی پر سے اکھیڑ لی گئیں۔ ایک بجے رات ایڈیٹر صاحب آئے تو انہیں کچھ خبر نہیں تھی۔ آتے ہی انہوں نے کاپی پر نظر ڈالی۔ پوچھا لیڈ کیا جا رہی ہے انہیں بتایا گیا کہ مارشل لاء لگا دیا گیا ہے۔ انہوں نے یہ سنا اور خاموشی سے اپنے کمرہ میں چلے گئے۔ ہم نے رات ۳ بجے کاپی پریس بھیجی۔ اور پھر صبح تک ایک ہوٹل میں بیٹھے اس مارشل لاء پر تبادلہ خیال کرتے رہے صبح ۷ بجے اخبار بازار میں آئے تو صرف کراچی کا روزنامہ انقلاب واحد اخبار تھا کہ جس میں انقلاب کی خبر سرے سے شائع ہی نہیں ہوئی تھی۔ باقی ملک بھر کے اخباروں میں یہ خبر بڑی بڑی سرخیوں کے ساتھ چھاپی گئی تھی۔ روزنامہ انقلاب اس وقت فیروز سنز کی ملکیت تھا۔ اور اس کے ایڈیٹر ارشاد احمد بیگ چغتائی تھے۔ پتہ چلا کہ انقلاب کی آخری کاپی معمول کے مطابق رات کو ۱۱ بجے چھپنے کے لئے بھیجی جا چکی تھی۔ اور سارے کارکن گھر جا کر سو چکے تھے۔

(باقی آئندہ)

کھلاڑی لڑکیاں کولڈ ڈرنک پر گزارہ کرتی رہیں



کراچی کی مختلف ٹیموں کی لڑکیاں مہمان خصوصی راجہ ایس ایم مجید کے ساتھ

لطافت علی صدیقی

۲۴ اگست کو نیشنل کوچنگ سنٹر میں مغربی پاکستان انٹر بورڈ گرلز اسپورٹس کے مقابلوں کی تقریبات' ایک ہفتے کی مدت گزارنے کے بعد بالآخر ختم ہوگئیں۔ کھیل کے مقابلوں میں 'میلے ٹھیلے' کا رنگ غالب رہا۔

لاہور کی لڑکیاں زیادہ پوائنٹس بنا کر کراچی سے 'جنرل ٹرافی' چھین لینے میں کامیاب ہوگئیں۔ مقابلوں میں کراچی کا نمبر دوسرا اور ملتان کا تیسرا رہا۔ چوتھی پوزیشن پر سرگودھا رہا۔ حیدرآباد اور پشاور بورڈ کھیل کے مقابلوں میں شریک نہیں ہوئے۔

ملتان 'والی بال' کا ٹائٹل حاصل کرنے میں کامیاب رہا۔ ملتان کی ٹیم نے بہتر کھیل کا مظاہرہ کیا۔ خصوصاً سابق ڈی آئی جی مسٹر اللہ نواز خان ترین کی صاحبزادی آنسہ فوزیا ترین عمدہ اور غیر معمولی کھیل پیش کرنے میں نمایاں رہیں۔

اس بار سرگودھا سے آئی ہوئی آنسہ اسحاق نے نٹ بال کے مقابلے میں عمدہ کھیل پیش کیا۔ اور اپنی ٹیم کی کامیابی کا سبب بن گئیں۔ سرگودھا کے حصہ میں بس یہی ایک ٹائٹل آیا۔ ان مقابلوں میں بائیں ہاتھ سے کھیلنے والی کراچی کی خاتون کھلاڑی آنسہ تسنیم سلطانہ، ہر مقابلے میں نمایاں رہیں۔ آل راؤنڈر تسنیم سلطانہ گورنمنٹ ویمن کالج میں سال دوم کی طالبہ ہیں۔ انہوں نے والی بال، نٹ بال اور بیڈمنٹن کے مقابلوں میں حصہ لیا۔ والی بال اور نٹ بال کے مقابلوں میں یہ تنہا کھلاڑی تھیں جو آسانی سے چھلانگ لگا کر بال کو نٹ کے اندر پہنچا دیتیں۔ وہ ان مقابلوں میں کسی پوزیشن سے بھی کھیل سکتی تھیں۔ دوسرے کھیلوں کی نسبت انہوں نے بیڈمنٹن کے سنگل مقابلوں میں اپنی تمام حریف کھلاڑیوں کو شکست دینے میں کامیاب ثابت ہوئیں۔ بلاشبہ انہیں سال رواں کی سب سے عمدہ خاتون کھلاڑی کا اعزاز دیا جا سکتا ہے۔ ان میں چیمپین بننے کی تمام صلاحیتیں موجود ہیں اگر ان کی تربیت پر توجہ دی گئی تو یقیناً وہ ایک دن قومی گرلز بیڈمنٹن ٹائٹل حاصل کرلیں گی۔ ہمیشہ مسکرانے والی خاتون کھلاڑی تسنیم دوسرے مقابلوں میں حصہ نہ لے سکیں۔ کیونکہ وہ پہلے دو تین مقابلوں کے دوران جسمانی طور پر بے حد تھک گئی تھیں۔ انہوں نے بتایا۔ "میں بہت زیادہ بوریت اور تھکن محسوس کر رہی ہوں۔ کیونکہ پہلے میں امتحان کی تیاری میں مصروف رہی اس کے بعد مقابلے کی تیاری کے لئے سخت محنت کرنی پڑی۔ یہی وجہ ہے کہ میں اپنے آپ کو کھیل کے دوسرے مقابلوں میں عمدہ کھیل پیش کرنے کے قابل نہیں پا رہی ہوں۔"

خواتین کھلاڑیوں میں یہ شکایت عام تھی کہ کھیل کے مقابلے ایسے وقت میں شروع کئے گئے جب کہ لڑکیاں عام طور پر امتحانات میں مصروف تھیں۔ یا چند دن پیشتر فارغ ہوئی تھیں۔ انہیں آرام کی مہلت دی گئی اور نہ ہی مقابلوں میں شرکت سے قبل تربیت کا موقع ملا۔ لڑکیوں کی رائے ہے کہ تعلیمی سال کے آغاز میں مقابلے کرائے جائیں۔

کراچی کی خاتون کھلاڑیوں کو ٹرانسپورٹ اور ریفریشمنٹ کی سہولت مہیا نہیں کی گئی۔ لڑکیاں ٹرانسپورٹ حاصل کرنے کے لئے اپنے گھر سے میلوں پیدل چلیں۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ کوچنگ سنٹر کے قریب آمد و رفت کی زبردست مشکلات درپیش ہیں۔ لڑکیوں کو مجبوراً ٹی وی ہاؤس یا حیدرآباد کالونی تک پیدل چل کر آنا پڑتا ہے۔

کراچی بورڈ کے پاس کھیل کے فنڈ میں لاکھوں روپے ہیں۔ ایک مائیکرو بس آسانی سے خریدی جا سکتی ہے۔ اگر یہ ممکن نہیں ہے تو کم از کم کرائے پر ایک بس بھی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ تاکہ لڑکیوں کی آمد و رفت میں سہولت رہے۔ اگر باقاعدہ منصوبہ بندی سے کام لیا جائے تو ہر چیز ممکن ہو سکتی ہے۔ میری ذاتی رائے ہے کہ مقابلوں کے دوران نیشنل کوچنگ سنٹر میں کھلاڑیوں کی عارضی رہائش کا بندوبست کیا جائے۔ اس طرح وہ صبح نو بجے سنٹر پہنچنے کی زحمت سے محفوظ رہیں گی

لڑکیوں میں دوسری شکایت 'ریفریشمنٹ' کے متعلق پائی گئی وقت پر انہیں ناشتہ نہیں دیا گیا۔ بیشتر لڑکیوں کو گھنٹوں کولڈ ڈرنک پہ گذارہ کرنا پڑا۔ کولڈ ڈرنک کا انتظام بھی مقابلے کے چوتھے روز کیا گیا۔ جب انگریزی کے ایک مقامی اخبار میں اس کے متعلق ایک خبر شائع ہوئی۔

ایک نو تشکیل اسپورٹس پروموشن ٹرسٹ کی طرف سے ٹرام گودی کا ٹھنڈا والا بلڈنگ کے عین سامنے ایک سنٹر تعمیر کرنے کا منصوبہ زیر غور ہے۔ پاکستان میں اپنی نوعیت کے اعتبار سے یہ منصوبہ واحد اور منفرد ثابت ہوگا۔ منصوبے کے مطابق جمنازیم میں ۱۰ ہزار سیٹیں ہوں گی۔ اس کی عمارت



آنسہ تسنیم سلطانہ

دس منزلہ ہوگی۔ اور اس میں ۳۰۰ دکانوں کی گنجائش رکھی جائے گی۔ اس کے علاوہ دفتری امور کے لئے ہزاروں کمرے ہوں گے۔ اس عمارت کی تیسری یا چوتھی منزل پر جدید طرز کا ایک سوئمنگ پول بھی ہوگا جس کے چاروں طرف "سونا" اور ترکی طرز کے غسلخانے تعمیر کئے جائیں گے۔ دکانوں اور دفتری کمروں سے ٹرسٹ کو مستقل آمدنی کا ذریعہ نکل آئیگا جسے کھیلوں کی بہتری پر خرچ کیا جا سکیگا۔ سنٹر کی تعمیر کے فوراً بعد دکانوں کو کرائے پر اٹھا دیا جائے گا۔ ابتدائی اخراجات پورے کرنے کے لئے ہفتہ میں ایک بار تمبولا، کھلانے کا منصوبہ بھی زیر غور ہے۔ اس منصوبے کی تکمیل میں بھی کئی مشکلات درپیش رہیں گی۔ جن کا ذکر قبل از وقت ضروری ہوگا۔ سب سے پہلے تو ٹریفک کا مسئلہ، کیونکہ یہ سنٹر بندر روڈ جیسی مصروف ترین سڑک کے کنارے تعمیر ہوگا۔ اس کے لئے کار پارکنگ کا انتظام بھی کر لیا گیا ہے۔ گاڑیاں کھڑی کرنے کے لئے پلاٹ کے چاروں طرف پارکنگ کی گنجائش نکالی جائے گی، دوسری مشکل تازہ ہوا کی آمد و رفت کی ہوگی۔ کیونکہ اس کے قریب ٹرام ورکشاپ ہے، اس لئے کھلاڑیوں کو تازہ ہوا حاصل کرنے میں دقت پیش آئیگی۔ قدرتی طور پر چھ کروڑ کے اس عظیم منصوبے کی تکمیل کی ذمہ داری جس شخص کے سپرد کی گئی ہے۔ وہ یقیناً ایک آزمودہ کار اور ایماندار آدمی ہوگا۔ لیکن بنیادی طور پر یہ ذمہ داری ٹرسٹ کی ہوگی کہ وہ منصوبے کی تشکیل کے دوران کسی قسم کی بد دیانتی یا خرد برد کا واقعہ رونما ہونے دے۔ جیسا کہ عام طور پر کھیل کی تنظیموں میں ہوتا آیا ہے۔ ٹرسٹ چند افراد پر مشتمل ہے۔ ایک چیئرمین، ایک سیکرٹری ایک خازن اور ایک رکن — درحقیقت یہ ایک بڑا منصوبہ ہے۔ اس میں ایسے خوشحال افراد کو بھی ٹرسٹی بنایا جا سکتا ہے جو اپنے حلقہ اثر سے فنڈ میں اضافہ کر سکیں اور ساتھ ہی فنڈ کے استعمال پر اپنی آنکھیں چوبیس گھنٹے کھلی رکھیں۔

اس منصوبے کی اصل ذمہ داری، اسپورٹس پروموشن ٹرسٹ کے سیکرٹری کو سونپی گئی ہے۔ جو بدقسمتی سے ایک مصروف ترین ماہر تعلیم ہیں۔ ان پر پہلے ہی سے مقامی، قومی اور بین الاقوامی کھیل کی تنظیموں کی دیکھ بھال کی بھاری ذمہ داری پڑی ہوئی ہے۔ ایسی صورتحال میں ایک بڑے منصوبے کو چلانے میں انہیں یقیناً بے شمار دشواریوں کا سامنا ہوگا۔ اسپورٹس پروموشن ٹرسٹ کے سیکرٹری کے کاندھوں پر کھیل کی جن تنظیموں کی ذمہ داری پہلے سے پڑی ہوتی ہے، انہیں یاد رکھنا بہت مشکل ہے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے، ان میں سے چند نام درج ذیل ہیں۔

بین الاقوامی

ورلڈ باکسنگ باڈی کے نائب صدر، ایشیائی باکسنگ فیڈریشن کے جنرل سیکرٹری، ورلڈ باکسنگ ریفری اور مصنفین کے نمائندے ہیں۔

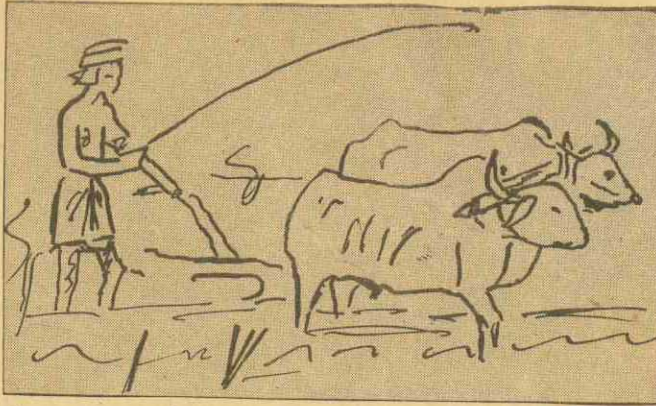
قومی

پاکستان باکسنگ فیڈریشن کے سیکرٹری، پاکستان اسپورٹس پروموشن ٹرسٹ کے سیکرٹری۔

مقامی

کراچی باکسنگ ایسوسی ایشن کے صدر، کراچی سوئمنگ ایسوسی ایشن کے صدر، کراچی ہاکی ایسوسی ایشن کے چیئرمین، کراچی جمناسٹک ایسوسی ایشن کے سرپرست

مذکورہ بالا تمام عہدوں کو بیک وقت یاد رکھنا کم از کم میرے لئے تو مشکل مسئلہ ہے۔ یہ بات بیحد دلچسپ اور عجیب و غریب ہے کہ ہمارے ملک میں ایسا کوئی قانون نہیں ہے جو ایک شخص کو بیک وقت اتنے سارے عہدوں پر قابض ہونے سے روک سکے یہ بات ویسے بھی خلاف فطرت ہے کہ ایک شخص اتنے ڈھیر سارے عہدوں پر براجمان رہ کر کھیل کے فروغ میں کوئی نمایاں کارنامہ انجام دے سکے۔ اس میں کھیل کا نقصان ہوگا۔ یا پھر این ای ڈی کالج کے طلباء متاثر ہوں گے۔ اس لئے کہ سیکرٹری صاحب بہرحال انسان ہیں مشین نہیں ہیں۔ میں ٹرسٹ کے حکام سے اپیل کروں گا کہ وہ ٹرسٹ کے لئے نیا سیکرٹری منتخب کریں اگر یہ صورتحال برقرار رکھی گئی تو اس بات کا قوی امکان ہے کہ جہاں کھیل کا معیار متاثر ہوگا۔ وہاں زیر غور منصوبہ بھی بری طرح متاثر ہوگا۔



ہنزہ سے چاٹگام تک

لائلپور

نوکر شاہی مفاد پرست طبقہ کے حق میں سرگرم عمل ہے

محمد یونس ایڈووکیٹ

وطن عزیز میں آبادی کا ۸۰ فی صد سے زیادہ حصہ دیہی زندگی گزار کر اپنی معاش کا بندوبست کرتا ہے۔ جن میں واضح اکثریت چھوٹے کاشت کاروں، مزارعین اور کھیت مزدوروں کی ہے۔ یہ مظلوم طبقہ اپنے بیوی بچوں سمیت رات دن خون پسینہ ایک کردیتا ہے لیکن دووقت کی روٹی میسر نہیں آتی۔ صرف یہ لوگ جاگیرداروں، وڈیروں اور خوانین کی خاطر دن رات مصیبتیں جھیلتے ہیں۔ اور دھرتی کا سینہ چیر کر فصلوں کی کاشت کرتے ہیں۔ جب فصل پک کر تیار ہوجاتی ہے تو لٹیرے طبقہ کے کارندے اس پر قبضہ جما لیتے ہیں۔ ہمارا مروجہ نظام معاشرہ اور اس کو چلانے والی نوکر شاہی بھی مفاد پرست طبقہ کے حق میں سرگرم عمل ہے۔

ہر فصل کی تیاری پر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ، سب ڈویژنل مجسٹریٹ یا اسسٹنٹ کمشنر صاحبان کی طرف سے جلی حروف میں اخبارات میں زیر دفعہ ۱۴۴ ضابطہ فوجداری کا حکمنامہ اشاعت پذیر ہوتا ہے۔ جس میں حکم دیا جاتا ہے کہ مالکان کو حصہ بٹائی کی عدم ادائیگی کی صورت میں فصل اٹھانے پر مزارعین کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے گی۔ عموماً ایسے احکامات فصل تیار ہونے سے کچھ عرصہ قبل جاری کئے جاتے ہیں۔ اور فصل اٹھائے جانے کی ممکنہ میعاد تک وقوع پذیر رہتے ہیں تاکہ جاگیردار خوانین اور وڈیروں کو اپنا حصہ وصول کرنے میں کسی قسم کی دشواری پیش نہ آئے۔

سرمایہ دارانہ نظام معیشت چونکہ لوٹ کھسوٹ پر مبنی ہے اس کو چلانے اور بچانے والا نظام قانون بھی اس کی ضمیر کی عکاسی کرتا ہے۔ یہ سلسلہ زندگی کے ہر شعبہ میں اپنی تمام ترا بذا رسانیوں کے ساتھ پوری قوت سے کار فرما ہے۔ سرمایہ داری نظام میں ہر عمل مفاد پرست طبقہ کے استحصالی تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے جاری وساری ہے۔ نوکر شاہی کے کل پرزے سرمایہ داری نظام کے چوکھٹے میں فٹ ہی اس لئے کئے جاتے ہیں کہ وہ سرمایہ دار اور جاگیردار طبقہ کے مفادات کی صحیح طور پر نگہداشت اور پاسبانی کرسکیں۔

اگر مزارعین بٹائی کی ادائیگی کے بغیر فصل اٹھانا چاہیں تو ان کے خلاف سرکاری ملازم کے احکام کی حکم عدولی کی پاداش میں ۱۸۸ تعزیرات پاکستان حرکت میں آسکتی ہے۔ جس کی سزا چھ ماہ قید یا ایک ہزار روپیہ جرمانہ تک کی صورت میں دی جاسکتی ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اندیشہ نقض امن عامہ صرف کسانوں، مزارعین اور کھیت مزدوروں کی طرف ہی سے لاحق رہتا ہے اس کا جواب واضح طور پر نفی میں ملتا ہے۔ پچھلے عام انتخابات میں پاکستان کے محنت کش اور مفلس کسانوں نے سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کی چیرہ دستیوں کا خاتمہ کرنے کے لئے جمہوری طریقہ سے عوام دوست جماعت پیپلز پارٹی کے نمائندوں کو کامیاب بنا کر جو انقلاب برپا کیا اس کے نتیجے میں سرمایہ داروں اور جاگیرداروں نے ہزاروں کی تعداد میں مل مزدوروں کو بلاوجہ اور غیر قانونی چھانٹی کی۔ اور بے دخلیوں کا طویل سلسلہ جاری کردیا تاکہ محنت کش طبقہ سے اس کی جرأت رندانہ کا حساب چکایا جائے کیا۔ متذکرہ دفعہ کا کلہاڑا سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے سر پر بھی چلایا گیا۔ جنہوں نے ہزاروں کی تعداد میں بلاوجہ چھانٹیاں اور بے دخلیاں کرکے اشتعال پھیلایا ــــ؟

ضرورت اس امر کی ہے کہ پاکستان کے محنت کش انقلابی دانشور، طالب علم اور غریب طبقہ متحد ہو کر جدوجہد کے ذریعہ اس فرسودہ نظام کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیں اور مساوات پر مبنی استحصال سے پاک معاشرہ کا قیام عمل میں لائیں، جس میں عوام کی حکمرانی ہو۔

بقیہ :۔ سنو آواز آرہی ہے

تم نے آزادی کو عیش سمجھا ہے۔ تم نے جائز و ناجائز، صحیح وغلط حق و ناحق کی حدود کو توڑا ہے تم جواب دو۔

سنو اے نام نہاد اہل نظر تم نے پاکستان کے تصور، چہرے کو ہر قومی موڑ پر مسخ کردیا۔ تم نے مٹی سے نم چھین لی تم نے کھیتیاں ویران کردیں۔

پاکستان کسی ایک فرقے، کسی ایک طبقے کسی ایک گروہ کی میراث نہیں، پاکستان عوام کی فلاح وبہبود کے لئے بنایا گیا تھا اور عوام کی مرضی ہی یہاں چلے گی۔

آزاد اور خود مختار قوموں کا چلن دیکھنا ہو تو سنو ہمالے کے چشمے ابل چکے گراں خواب چینی سنبھل چکے

سنو، ساقیا اب اپنا جام گردش میں لانے کا وقت آگیا

سنو، تعلیم عام کرو، نظام تعلیم کو بامقصد بناؤ، یکساں نظام تعلیم بناؤ، یہ قومی کردار کی تعمیر کی پہلی اینٹ ہے۔

سادگی کو شعار بناؤ، عالیشان بنگلوں کو درس گاہوں میں تبدیل کرو، یہ ایثار ہے، یہ قربانی ہے، اشیائے تعیش کی درآمد بند کرو،

قومی لباس ایک بناؤ، تاکہ ظاہری اونچ نیچ بھی ختم ہو۔

محنت کی عزت، پیشہ کی عزت کا جذبہ ابھارو،

نوجوانوں کے جوش کو تعمیری کاموں پر لگاؤ۔ یہ میلے

ٹھیلوں، کلچرل اور فیشن شوز کا وقت نہیں، یہ اخلاقی اور سماجی برائیوں کے خلاف منظم تحریک چلانے کا وقت ہے۔

مایوسی قومی موت ہے، زندہ لوگ مرا نہیں کرتے، امر ہو جاتے ہیں، قدم ملاؤ، آگے بڑھو، بے عملی تباہی کے دہانے پر لے جاتی ہے۔"

سنو، خاموش تماشائی نہ بنو، دوسروں کو اپنے مسائل حل کرنے پر مامور نہ کرو، یہ دورِ غلامی کی عادت ہے۔

سنو تم آزاد ہو، آزاد لوگ ذمہ دار ہوا کرتے ہیں، تم بھی اجتماعی بھلائی کے ذمہ دار ہو، آزاد پاکستان میں تم حاکم بھی ہو اور محکوم بھی،

بقیہ :- الفتح انکشاف

پر برقرار رکھنے کے لئے جماعت اسلامی اور دوسرے اسلام پسندوں کی زبردست کوشش اور پروپیگنڈا مہم کے باوجود مدت ملازمت میں مزید توسیع نہ ملنے کی ایک بنیادی وجہ ڈاکٹر علی اشرف کی وطن دشمنی بھی تھی۔ علی اشرف کے فرار ہونے کی تمام تر ذمہ داری ڈاکٹر قریشی پر عائد ہوتی ہے جن کی شخصی ضمانت پر انہیں ملک سے باہر جانے کی اجازت حاصل ہوئی

جامعہ کراچی سے قریبی تعلق رکھنے والے حلقوں کا کہنا ہے کہ علی اشرف پر ڈاکٹر قریشی کا ہمیشہ دست شفقت رہا، وہ ہمیشہ ان پر مہربان رہے، ان کی ترقی کے لئے انہوں نے جامعہ کے بہت سے مستحق اساتذہ کی حق تلفی کی اور علی اشرف کو شعبۂ انگریزی کا سربراہ بنا دیا۔ بتایا جاتا ہے کہ علی اشرف نے جامعہ کراچی میں اپنی ملازمت کا آغاز جونیئر لیکچرر سے کیا۔ پھر ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کی سفارش پر وہ اعلیٰ تعلیم کے لئے لندن بھیجے گئے۔ جہاں کیمبرج سے انہوں نے انگریزی ادبیات میں ڈاکٹریٹ حاصل کی۔ لندن کے دوران قیام وہ تعلیم سے زیادہ پی۔ ای۔ این اور کانگریس فار کلچرل فریڈم کی سرگرمیوں میں مصروف رہتے تھے۔ اور اس سلسلے میں واشنگٹن اور پیرس کے دورے کرتے تھے، جلسے منعقد کرتے تھے، تقریریں کرتے تھے اور اخبارات میں مضامین لکھتے تھے اور ان کا موضوع ہمیشہ سوشلزم کی مخالفت اور امریکی سامراج کی کھلم کھلا حمایت ہوتی تھی، انہی سرگرمیوں کے دوران ان پر اسلام پسندی کا غلبہ ہوا۔ انہوں نے اپنے بیشتر مضامین میں کھل کر وکالت کی اسلام کی سربلندی اور اس کے تحفظ کے لئے مسلمانوں کو امریکہ سے تعاون کرنا چاہیئے۔ نیز یہ کہ مسلمان ریاستوں کی آزادی اور خودمختاری صرف اور صرف امریکہ کی سرپرستی میں ممکن ہے۔

غرضیکہ جب وہ لندن سے ڈاکٹریٹ لے کر آئے تو ان کا لباس شیروانی اور تنگ موری کا پائجامہ تھا۔ اور چہرے پر داڑھی تھی۔ گذشتہ چند سال سے ان کی وضع قطع یہی تھی۔

علی اشرف کے بڑے بھائی ڈاکٹر علی احسن وضع قطع اور انداز فکر میں اپنے بھائی سے اس قدر یکسانیت رکھتے ہیں کہ دونوں جڑواں معلوم ہوتے ہیں۔ علی احسن بھی اپنی اسلام پسندی، امریکہ پرستی اور سوشلسٹ دشمنی کے لئے بہت مشہور ہیں۔ ادیب کی حیثیت سے بنگلہ ادب میں وہ علی اشرف سے زیادہ ممتاز ہیں انہوں نے شاعری بھی کی، ڈرامے بھی لکھے اور تنقیدی مضامین بھی۔ لیکن عام زندگی میں وہ جس قدر اسلام پسند نظر آتے ہیں اور اسلامی اقدار کا جس قدر پرچار کرتے ہیں۔ اپنی شاعری میں وہ اس کی ضد نظر آتے ہیں ان کی شاعری کا موضوع بنیادی طور پر جنسی تلذذ اور لذت کوشی ہے اس حد تک کہ اس پر فحاشی کا الزام عائد ہوتا ہے اس حیثیت سے ان کی شاعری اردو کے شاعر میراجی مرحوم سے بہت قریب ہے

اس تضاد کے بارے میں بنگلہ ادیبوں کا خیال ہے کہ شاعری ان کی فکر اور رجحان طبع کی نمائندگی کرتی ہے اور وضع قطع کا تعلق ان کے کاروبار سے ہے اس کاروبار سے جس کی بدولت وہ اور ان کے چھوٹے بھائی علی اشرف سال کا بیشتر حصّہ ملک سے باہر گذارتے تھے۔ دونوں بھائیوں کے لئے مشہور ہے کہ وہ سال کے کم از کم آٹھ مہینے امریکہ، برطانیہ یورپ یا جاپان میں کسی نہ کسی ثقافتی اجتماع یا اسکالرشپ کے نام پر سیر کرتے تھے۔ علی اشرف جامعہ کراچی میں تدریس پر کتنا وقت صرف کرتے تھے اس کا جواب ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی ہی دے سکتے ہیں جنہوں نے علی اشرف کو ہر طرح کی سہولتیں مہیا کیں اور آنکھیں بند کر کے انہیں ترقی پر ترقی دیتے چلے گئے۔ لندن سے ڈاکٹریٹ کے بعد علی اشرف آئے تو انہیں فوراً ریڈر بنایا گیا۔ بابا جمیل شعبۂ انگریزی کی سربراہ تھیں، انہیں ہٹا کر علی اشرف کو سربراہ مقرر کیا گیا، کیوں؟ ورلڈ یونیورسٹی سروس، پی۔ ای۔ این۔ اور کانگریس فار کلچرل فریڈم، سی آئی اے کے تین مختلف روپ، تین مختلف چہرے۔ اور یہ اسلام پسندی کیا ہے "ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیئے"۔

جامعہ کراچی کے موجودہ وائس چانسلر ڈاکٹر محمود حسین نے حال ہی میں پھر اعلان کیا تھا کہ وہ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کے نقش قدم پر چلیں گے۔ کیا ان حقائق کے باوجود وہ اپنے ارادے پر قائم رہیں گے؟ کیا ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اور ڈاکٹر محمود حسین ایک ہی تکے کے دو چہرے رہیں گے؟ کیا جامعہ اسی طرح سازشوں کا شکار رہے گی؟ کیا جامعہ اسی طرح سی آئی اے کی سرگرمیوں کی آماجگاہ بنی رہے گی؟ کیا جامعہ اسی طرح وطن دشمنوں کی سرپرستی کرتی رہے گی؟ امید ہے کہ سرکاری سطح پر ہونے والی تحقیقات ان سوالات کے جواب مہیا کرے گی۔

بقیہ : سرمایہ دار معاشرے کا دوسرا رُخ

لن وائٹ نے اپنی ناکامی پر پردہ ڈالنے کے لئے اس واقعہ کی ذمہ داری صرف ایک پراسرار عورت کے سر پر ڈال رکھی ہے۔ اس طرح وہ برطانوی حکام اور پریس کو یہ باور کرانا چاہتا ہے کہ چونکہ اغوا میں صرف ایک عورت ملوث ہے اس لئے اسے ڈھونڈ نکالنے میں مشکلات کا سامنا ہے۔ اگر یہ کسی منظم گروہ کا کام ہوتا تو بچی کا آسانی سے پتا چل جاتا کیونکہ ایسے کام کرنے والے بیشتر گروہ کا ریکارڈ پولیس اور محکمہ سراغرسانی کے دفتر میں موجود ہوتا ہے۔ اس قسم کے گروہ سے تعلق رکھنے والے افراد کا پتا لگانا زیادہ مشکل بات نہیں ہوتی

جرائم کے ماہرین کا خیال ہے کہ لن وائٹ کا یہ اندازہ محض مفروضے پر ہے۔ وہ اپنی ناکامی کو چھپانے کے لئے اغوا کی ذمہ داری ایک عورت پر ڈال رہا ہے۔ اغوا کا واقعہ جس انداز میں ظہور پذیر ہوا ہے۔ اس سے صاف پتا چل رہا ہے کہ اس کے پیچھے زیر زمین کام کرنے والے ایک منظم گروہ کا ہاتھ ہے۔ اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ پانچ ماہ کی بچی کو ایک عورت ہی نے اغوا کیا تو یہ کس طرح سے کہا جا سکتا ہے کہ اس عورت کا تعلق کسی منظم گروہ سے نہیں ہے۔ اس کے علاوہ پانچ ماہ کی بچی کو اغوا کر کے اسے قانون کی نگاہوں سے زیادہ پوشیدہ رکھنا کسی ایک عورت کے بس کی بات نہیں ہے

بقیہ : اداریہ

عوام دوست سیاسی جماعتوں کو اب حالات کو ان زاویوں سے دیکھنا چاہیئے۔

۱:- امریکہ، اس کے دوست ایشیائی ممالک پاکستان کے بارے میں کیا رویہ اختیار کر رہے ہیں، ان کی کیا سرگرمیاں ہیں؟

۲:- بھارت نام نہاد "بنگلہ دیش" کے بارے میں اپنے موقف میں نرمی کیوں اختیار کر رہا ہے۔

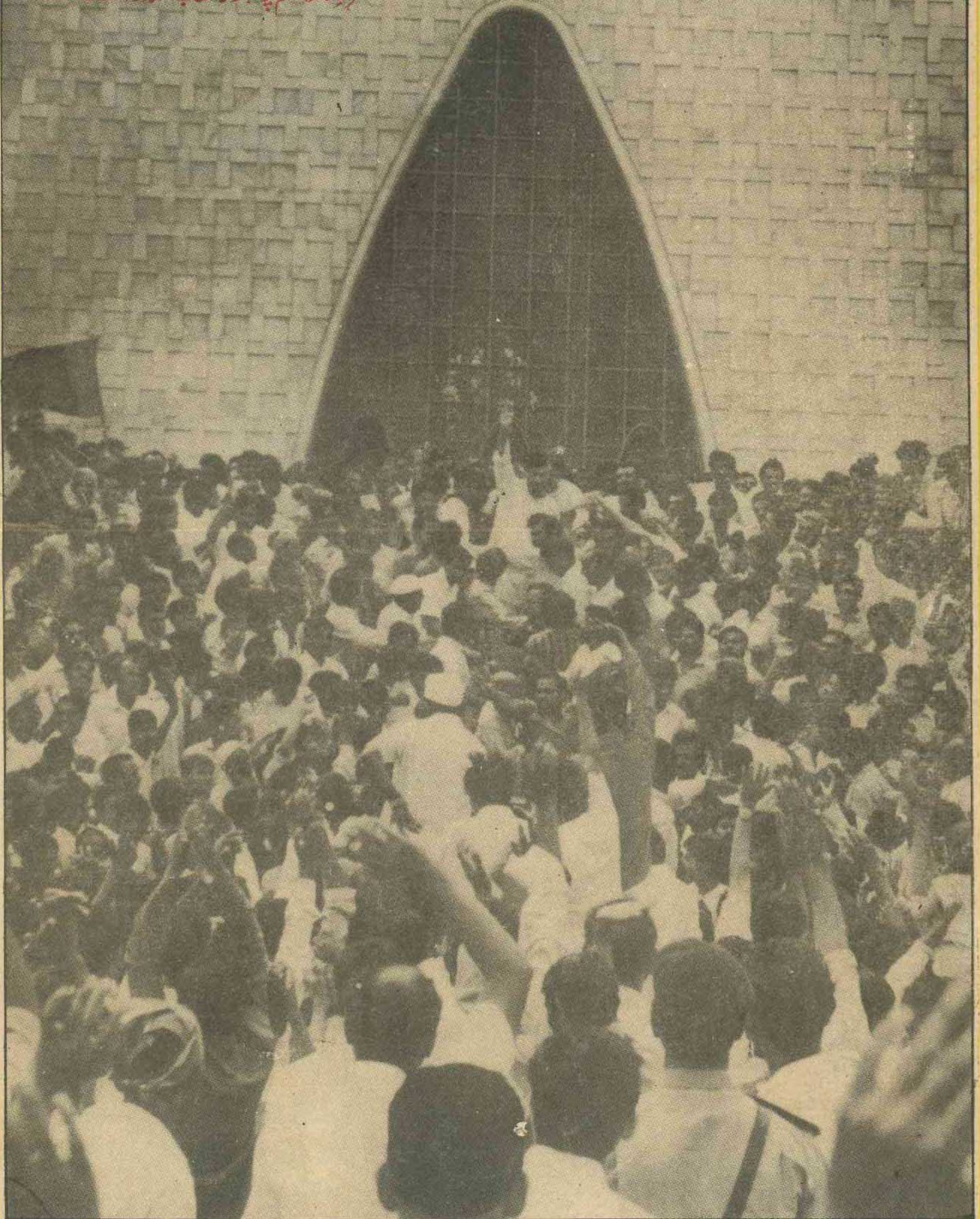
۳:- پاکستان کی اقتصادی حالت کیا ہے؟ کون سے ممالک پاکستان کی برآمدات قبول کرتے ہیں اور کن شرائط پر؟

۴:- مشرقی پاکستان میں دائیں بازو کی جماعتیں کیا راستہ اختیار کرتی ہیں؟

Regd No : S - 2772
Weekly "Al - Fatah" Karachi
16 - 23, SEPTEMBER, 1971

"آؤ مزدوروں، کسانوں کے بیٹو! ظلم واستحصال کی زنجیریں کاٹ کر وطن کو آزاد کرائیں"

مزارِ قائداعظم پر بھٹو کا خطاب ۔ (فوٹو: الطاف ماما)



حقی آفسٹ پریس لیاقت آباد۔ کراچی